معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ سو روپے فی شمارہ دس روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو پچاس روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ۔ کراچی

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY , AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہئے اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن 25% ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۶۸ ماہ رمضان المبارک ۱۴۲۲ھ مطابق ماہ دسمبر ۲۰۰۱ء عدد ۶

فہرست مضامین

شذرات

۱۸ رنومبر 1914ء کو دار المصنفین شبلی اکیڈمی کے بانی و مؤسس علامہ شبلی نعمانیؒ کی وفات ہوئی تھی، اس تاریخ کو ہر سال اعظم گڑھ میں ان سے نسبت رکھنے والے ادارے دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج، شبلی نیشنل انٹر کالج اور شبلی نرسری اسکول بند رہتے ہیں اور صبح فجر کی نماز کے بعد سے ۹ بجے تک شبلی اکیڈمی کی مسجد میں قرآن خوانی ہوتی ہے، مسجد سے متصل ہی علامہ کی قبر ہے جہاں لوگ منفرداً دعائے مغفرت کرتے ہیں، ۱۰ بجے سے ۱ بجے تک شبلی کالج کے کانوکیشن ہال میں جلسہ ہوتا ہے جس میں طلبہ، اساتذہ اور رفقائے دار المصنفین کی تقریریں ہوتی ہیں، ڈھائی بجے سے شبلی انٹر کالج میں طلبہ کی تقریروں اور مقابلوں کا پروگرام ہوتا ہے، کبھی کبھی ان جلسوں میں باہر کے مقررین اور فضلا بھی تشریف لاتے ہیں اور علامہ شبلی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں، اس دن ہونے والے جلسے فائدے سے خالی نہیں ہیں، دونوں کالجوں میں طلبہ کی تعداد تقریباً دس ہزار ہے، جن میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے اور اساتذہ بھی پانچ سو کے قریب ہوں گے جو مختلف یونیورسٹیوں کے پڑھے اور ملک کے مختلف علاقوں کے ہیں، ان سب کو علامہ شبلی کی عظیم شخصیت، ان کے تعلیمی نظریات اور گوناگوں کارناموں سے کوئی واقفیت نہیں ہوتی، خود مسلمانوں کی نئی نسلیں اپنے بزرگوں کی عظمت اور شاندار خدمات سے بالکل ناآشنا ہوتی جارہی ہیں، اس لئے ان کو اسلاف کے کارناموں سے باخبر رکھنے اور ان کے ذہنوں میں بزرگوں کی عظمت کا نقش بیٹھانے کے لئے اس طرح کے جلسے اور دوسری تدبیریں کرنی پڑیں گی۔

ان جلسوں کو رسمی بنانے سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ طلبہ و اساتذہ اور اداروں سے وابستہ حضرات علامہ شبلی کے عظمت شناس اور ان کے مقاصد و نظریات سے کلی اتفاق رکھتے ہوں، ذمہ دار لوگ ان کے مقصد و مشن کو بہ روئے کار لانے کا ولولہ رکھتے ہوں انہیں علم و تعلیم سے شغف ہو اور وہ علامہ شبلی کے افکار و تعلیمی نظریات سے گہری دلچسپی اور مناسبت رکھتے ہوں، علامہ شبلی عالمگیر شہرت کے مالک تھے، ہندوستان کے اکثر علمی و تعلیمی اداروں پر ان کی گہری چھاپ ہے، لیکن ان کی سب سے عظیم الشان یادگار دار المصنفین شبلی اکیڈمی ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں کا بڑا مایہ ناز ادارہ اور قیمتی اثاثہ ہے، اس کے تحفظ و بقا اور اس کی توسیع و ترقی کا سامان کرنے ہی سے علامہ شبلی کی قدردانی اور یاد منانے کا حق ادا ہوسکتا ہے اور یہ پوری قوم خصوصاً علامہ شبلی کے مداحوں اور قدردانوں کی بڑی ذمہ داری ہے۔ اس ادارے کی آمدنی کا اصل ذریعہ اس کی تجارت ہے لیکن قوم کی بے توجہی اور ملک کی عام بدمذاقی کی وجہ

سے اس میں یوماً فیوماً کمی ہوتی جارہی ہے، ہندوستان اور پاکستان کے خود غرض ناشرین اس کی کتابیں بڑی ڈھٹائی سے چھاپ رہے ہیں، حکومت اور انتظامیہ کی وہ نسل ختم ہوگئی جو علامہ شبلی کی عظمت اور خدمات سے واقف تھی اور دار المصنفین کو قوم کا ایک تہذیبی و ثقافتی ورثہ سمجھتی تھی، اب ان لوگوں کے ہاتھوں میں ملک کی باگ ڈور ہے جن کو مسلمانوں کی ایک ایک یادگار کو مٹانے اور ملک کو پراچین کال میں لے جانے سے دلچسپی ہے، ایسی صورت میں دار المصنفین کے تحفظ اور مالی استحکام کے لئے ہماری نظر قوم کے مخیر لوگوں اور علامہ شبلی کے قدردانوں ہی کی جانب اٹھتی ہے۔

پروفیسر محمد شمیم جیراج پوری مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے بانی وائس چانسلر ہیں، وہ یونیورسٹی کو ہمہ جہتی ترقی دے رہے ہیں، اب اس نے برگ و بار لانا شروع کیا ہے، اس لئے ہر طرف سے یہ آوازیں اٹھ رہی ہیں کہ انہیں یونیورسٹی کی خدمت کا موقع مزید ایک ٹرم کے لئے ملنا چاہئے، گذشتہ سال سے یونیورسٹی کے زیر اہتمام مولانا آزاد کے یوم پیدائش ۱۱ رنومبر کو ان پر سمینار منعقد ہو رہا ہے یہ گذشتہ سال حیدرآباد میں ہوا تھا اور اس سال بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی کی سائنس اکیڈمی کے سمینار ہال میں ہوا جس میں راقم کو بھی شرکت کا موقع ملا، ایک ہی روز میں سمینار کے چار جلسے ہوئے، پہلے جلسے کی صدارت سابق چیف جسٹس اے۔ ایم احمدی نے کی جس میں جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر صاحبان، سید شہاب الدین اور پروفیسر نامور سنگھ کی پرمغز تقریریں ہوئیں، سراج حسین صاحب نے تشویش ظاہر کی کہ اتر پردیش میں تقریباً ایک لاکھ سرکاری پرائمری اسکول ہیں، جن میں تقریباً ۴۰۰ اردو اسکول ہیں لیکن کوئی ریگولر اردو میڈیم مڈل اسکول نہیں۔ اور ہائی اسکول اور انٹر کے امتحانات اردو میں دیے جانے کی اجازت نہیں، ابتدائی سطح پر اردو کی تعلیم نہ ہونے پر اردو یونیورسٹی کو طلبہ کیسے ملیں گے۔ جسٹس احمدی نے مولانا آزاد کی تحریروں کو انگریزی اور اردو میں بہتر طور پر منتقل نہ کئے جانے کی شکایت کی اور مولانا آزاد کی جامع مسجد کی تقریر کے حوالے سے کہا کہ مسلمانوں کو کسی مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکٹ لینے کی ضرورت نہیں۔

یونیورسٹی کے چانسلر اور سابق وزیر اعظم اندر کمار گجرال دوسرے جلسے کے صدر اور صدر جمہوریہ مسٹر کے۔ آر نارائن مہمان خاص تھے، اس کا آغاز پروفیسر جیراجپوری کے خطبہ استقبالیہ سے ہوا جس میں یونیورسٹی کی چار سالہ کارگزاری اور آئندہ کے منصوبوں کا ذکر بھی تھا۔ کے۔ آر نارائن نے مولانا کو مفکر، دانشور اور ملک کے مستقبل پر نظر رکھنے والا دوراندیش قومی رہنما قرار دیا اور اردو کو ہندوستان کی تیسری

بڑی زبان کہا، گجرال صاحب نے ۱۹۳۹ء سے ۴۶ءتک مولانا کے مسلسل ۷ برس تک کانگریس کے صدر رہنے اور مختلف مشنوں سے مذاکرات کرنے وغیرہ کی تفصیل پیش کی اور اردو کے قومی زبان ہونے پر فخر کیا۔ تیسرا جلسہ لنچ کے بعد ڈاکٹر اخلاق الرحمان قدوائی کی صدارت میں ہوا، اس میں ڈاکٹر اختر الواسع، ڈائرکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ، موسیٰ رضا اور راقم الحروف کو اظہار خیالات کا موقع دیا گیا، ڈاکٹر صاحب کے خطبہ میں بڑی کارآمد باتوں اور مفید تجویزوں کا ذکر تھا، چوتھے جلسے کی صدارت جناب سید حامد چانسلر جامعہ ہمدرد نے فرمائی اور خواجہ حسن نظامی ثانی، ڈاکٹر خلیق انجم اور پروفیسر قمر رئیس کی تقریریں ہوئیں، سید صاحب نے صدارتی خطبے میں سیمینار میں بیان کئے گئے نکات کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے ان پر مفید اضافے اور قیمتی مشورے دئے، ڈاکٹر خلیق انجم نے مولانا کو ملک کا اہم اور جنگ آزادی کا سب سے بڑا مدبر رہنما قرار دیتے ہوئے انہیں نظر انداز کئے جانے کی "پالیسی" کا ذکر بڑے دکھ سے کیا، سیمینار کا آغاز یونیورسٹی کی مجلس عاملہ کے رکن پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے لکھے ہوئے ترانے سے ہوا، سیمینار کی کامیابی کے لئے وائس چانسلر صاحب اور ان کے رفقا لائق تبریک ہیں۔

حکیم عبدالحمید مرحوم کے ایما سے ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کا ذیلی ادارہ ہمدرد اسٹڈی سرکل اقلیتوں اور دوسرے پس ماندہ طبقات کے امیدواروں کو سول سروسز میں داخلے کے امتحان کے لئے تیار کرانے کا اپنا شاندار ریکارڈ قائم کر چکی ہے، اقلیتوں کی نمایندگی دفاعی خدمات یا ڈیفنس سروسیز میں بھی بہت کم رہ گئی ہے اس لئے یونین پبلک سروس کمیشن کے متعلقہ امتحانوں کے لئے بھی مسلمان اور دوسرے پس ماندہ طبقات کے امیدواروں کو تربیت دینے کے لئے سوسائٹی نے اپنے صدر عبدالمعید صاحب سے منظوری لے کر طے کیا کہ ڈیفنس سروسیز کا جو امتحان یونین پبلک سروس کمیشن کی طرف سے مختلف مراکز میں ۷/اپریل ۲۰۰۲ کو لیا جائے گا، اس کے لئے ۷/جنوری ۲۰۰۲ء سے ہمدرد کوچنگ سینٹر تعلیم آباد میں تربیت دی جائے گی۔ سروسز کے سلسلے کی مزید معلومات کے لئے ۳/نومبر ۲۰۰۱ء کا "ایمپلائمنٹ نیوز" یا "روزگار سماچار" دیکھیں اور کوچنگ کے بارے میں مزید معلومات ڈائرکٹر ہمدرد کوچنگ سینٹر، تعلیم آباد، سنگم وہار، نئی دہلی-110062 (ٹیلی فون نمبر 6088848) سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ جناب سید حامد صاحب کو توقع ہے کہ "فوج، بحریہ اور فضائیہ میں اگر ہم بڑی تعداد میں داخل ہوسکے تو ایک طرف مسلمانوں کی ساکھ میں اضافہ ہوگا۔ دوسری طرف ان کے خلاف عصبیت اور ان سے اہل وطن کی دوری میں کمی آئے گی۔"

مقالات

قرآن اور کائنات ایک دوسرے کے لئے مذکر

از مولانا محمد شہاب الدین صاحب ندوی ٭

(۲)

قرآن اور کائنات میں بہت سی مشابہتیں موجود ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے تذکیر و تنبیہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ یعنی ان میں سے کسی ایک میں بصیرت حاصل کرنے کے بعد جب دوسرے کا مطالعہ کیا جائے تو فوراً تنبہ ہوتا ہے اور بعض عجیب و غریب حقائق و اسرار سامنے آتے ہیں جیسے کوئی فراموش کردہ یا بھولی بسری حقیقت اجاگر ہو رہی ہو۔ اس لحاظ سے یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے ایک آئینے کی طرح ہیں۔ گویا کہ ہر ایک دوسرے میں اپنی ہی شکل و صورت دیکھ رہا ہو۔ اس اعتبار سے دونوں ایک دوسرے کے لئے "مذکر" (کسی بھولی بسری حقیقت کو یاد دلانے) کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

چنانچہ قرآن اور نظام کائنات کے لئے کلام الٰہی میں جا بجا ذکر، ذکریٰ، تذکر اور تذکرہ وغیرہ الفاظ بکثرت لائے گئے ہیں اور ان سب کی اصل "ذ ک ر" ہے۔ ذکر اور ذکریٰ کے معنی کسی چیز کو یاد کرنے یا یاد آجانے کے ہیں اور تذکیر وہ چیز ہے جو یادداشت اور تدبر پر ابھارنے والی ہو۔ اسی طرح تذکرہ بھی وہ چیز ہے جو یادداشت پر ابھارنے والی ہو تذکرہ کے

٭ جنرل سکریٹری فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ۔ بنگلور ۲۹۔

معنی یاد کرنے یا یادداشت کو حاضر کرنے یا تدبر کرنے کے ہیں[۱]۔

قرآن سارے جہاں کے لئے ایک تذکرہ

اس لحاظ سے ان الفاظ کا مطلب ہوا کسی بھولی بسری حقیقت کا اچانک یاد آجانا، یا ایک چیز کو دیکھ کر ذہن میں کسی دوسری چیز کا استحضار ہونا۔ اردو زبان میں اس کی صحیح تعبیر "چونکنا" یا "چونکانے والی چیز" ہوسکتی ہے۔ کلام الٰہی میں قرآن حکیم کے علاوہ بعض عجیب و غریب مظاہر عالم کے لئے بھی ذکر، ذکری اور تذکرہ کے الفاظ لائے گئے ہیں تو ان مواقع پر یاد دہانی کرانے یا چونکانے والی چیز کے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن حکیم میں کائناتی اسرار و حقائق اس انداز میں سمودئے گئے ہیں کہ جب کبھی تحقیقات جدیدہ کی رو سے کسی نئی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے تو ایسے مواقع پر قرآنی بیانات اس طرح واضح ہوکر سامنے آتے ہیں گویا کہ وہ چونکانے والے حقائق ہیں اور ان حقائق کے اثبات سے یہ علمی ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ اس مادی کائنات کے ماورا کوئی ایسی ازلی ہستی ضرور موجود ہے جو اس کائنات کی خالق ہی نہیں بلکہ اس کی مشنری کے تمام بھیدوں اور اس کے کل پرزوں کے ایک ایک راز کو جاننے والی ہے اور اسی نے یہ حیرت انگیز کلام بھی نازل کیا ہے۔ ورنہ قرآن اور کائنات میں اس قدر زبردست موافقت ہرگز نہ پائی جاتی ظاہر ہے کہ جو چیز خود بخود یا آپ سے آپ وجود میں آگئی ہو اور جو کلام کسی انسان کا گھڑا ہوا ہو، وہ ایک دوسرے کے اس طرح مطابق و موافق نہیں ہوسکتے کہ ان دونوں میں سرمو بھی فرق نہ ہو۔ یہ قرآن عظیم کا وہ علمی اعجاز ہے جو پورے عالم انسانی کو مبہوت کرنے کے لئے کافی ہے۔ بہرحال اس موقع پر قرآن عظیم کے ذکر، ذکری اور تذکرہ ہونے کے سلسلے میں چند آیات ملاحظہ ہوں:

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ

ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لئے

هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (زمر: ۲۷-۲۸)

ہر طرح کی مثالیں بیان کردی ہیں تاکہ وہ متنبہ ہوسکیں۔ یہ ایک واضح اور غیر پیچیدہ قرآن ہے تاکہ لوگ (اس کے حیرت انگیز مضامین پر متنبہ ہوکر اللہ سے) ڈر سکیں۔

هٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ۔ (انعام: ۱۲۶)

یہ تیرے رب کا سیدھا راستہ ہے ہم نے متنبہ ہونے والوں کے لئے (اپنی) نشانیاں وضاحت کے ساتھ بیان کردی ہیں۔

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ (عنکبوت: ۵۱)

کیا یہ بات ان (کی یقین آوری) کے لئے کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ پر وہ کتاب نازل کی ہے جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے، یقیناً اس میں ایمان لانے والوں کے لئے رحمت اور تنبیہ کا سامان موجود ہے۔

وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ۔ (ابراہیم: ۲۵)

اللہ لوگوں کے لئے (علوم و فنون سے متعلق) مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ چونک سکیں۔

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا

یہ صورت ہم نے اتاری ہے اور اسے

وَاَنْزَلْنَا فِیْھَا اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ لَّعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ (نور: ۱)

فرض قرار دیا ہے اور اس میں واضح نشانیاں اتار دی ہیں تاکہ تم چونک سکو

چونکہ قرآن اور کائنات کی مطابقت میں مذکور تذکیر و تنبیہ کے استنباط کے لئے بہت زیادہ غور و فکر اور تحقیق و جستجو کرنی پڑتی ہے اس لئے اہل دانش و اہل بصیرت کو خصوصیت کے ساتھ اس کام پر ابھارا گیا ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰہُ اِلَیْکَ مُبٰرَکٌ لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِہٖ وَلِیَتَذَکَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔ (ص: ۲۹)

یہ ایک برکت والی کتاب ہے جو ہم نے آپ کے پاس بھیج دی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات میں تدبر کریں اور پختہ عقل والے (اس کے انوکھے مضامین پر) متنبہ ہوسکیں۔

ھٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِیُنْذَرُوْا بِہٖ وَلِیَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا ھُوَ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ وَّلِیَذَّکَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (ابراہیم: ۵۲)

یہ (قرآن) تمام لوگوں کے لئے ایک پیغام ہے، تاکہ ان کو اس کے ذریعہ ڈرایا جائے اور (اس کے نتیجے میں) وہ جان لیں کہ اللہ ہی (اس کائنات کا) واحد معبود ہے اور اہل دانش متنبہ ہوسکیں۔

قرآنی مضامین میں تدبر کرنے کے سلسلے میں مزید دو آیات اس طرح وارد ہوئی ہیں:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا (محمد: ۲۴)

کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں؟

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا (نساء: ۸۲)

کیا یہ لوگ قرآن (کے حیرت انگیز مضامین) میں غور نہیں کرتے؟ اگر یہ کلام اللہ کی طرف سے نہ ہوتا تو وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔

یہ تذکرہ و تبصرہ آج چونکہ عقلی اور سائنٹفک دلائل کی روشنی میں سامنے آرہا ہے اس لئے وہ سارے جہاں کے لئے تنبیہ یا حجت کا باعث ہے۔ چنانچہ علمی دلائل کی روشنی میں حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ یہ کلام برحق ہے اس لئے اس پر ایمان لانا عقلی اعتبار سے ہر ایک کے لئے ضروری ہے۔ مگر اس سلسلے میں کسی پر کوئی جبر یا دباؤ نہیں ہے بلکہ اس کے سامنے دونوں راستے کھلے ہوئے ہیں: یا تو وہ صراط مستقیم کو اختیار کرکے اپنی اخروی نجات کا سامان کرلے یا گمراہی پر اڑتے ہوئے ابدی لعنت کا مستحق بن جائے۔ اسے دونوں باتوں کا اختیار ہے۔

قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِنْ ھُوَ اِلَّا ذِکْرٰی لِلْعٰلَمِیْنَ۔ (انعام: ۱۰)

کہہ دو کہ میں اس کے لئے تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا، یہ تو سارے جہان کے لئے ایک تذکرہ ہے (لہذا اسے جو کوئی اختیار کرنا چاہے وہ اپنی مرضی سے اختیار کرے)

اِنَّ ھٰذِہٖ تَذْکِرَۃٌ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیْلًا۔ (مزمل: ۱۹)

یہ تو ایک یاد دہانی ہے لہذا جو چاہے (اپنی مرضی سے) اپنے رب کا راستہ اختیار کرے۔

کَلَّآ اِنَّہٗ تَذْکِرَۃٌ فَمَنْ شَآءَ

نہیں نہیں یہ تو ایک تنبیہ کی چیز ہے

ذَکَرَہٗ۔ (مدثر : ۵۴) لہٰذا جو چاہے وہ متنبہ ہو جائے۔

فَذَکِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ یَّخَافُ وَعِیْدِ (ق : ۴۵)

تم قرآن کے ذریعہ اسے آگاہ کر دو جو میری وعید سے ڈرنے والا ہو۔

فَذَکِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَکِّرٌ۔ (غاشیہ : ۲۱)

تم (لوگوں کو) یاددہانی کرادو، تم تو صرف یاددہانی کرانے والے ہی ہو۔

الغرض قرآن حکیم چونکہ مختلف قسم کے تذکروں یا چونکانے والے حقائق سے بھرا ہوا ہے۔ اس لئے اسے "تذکرہ والا قرآن" بھی کہا گیا ہے:

صٓ، وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ (ص : ۱) صاد، یہ تذکرہ والا قرآن شاہد ہے۔

یہاں پر بقول علامہ ابن قیمؒ مقسم علیہ محذوف ہے یعنی اس قرآن کا بندوں کے احوال کے مطابق انہیں متنبہ کرنے والے تذکروں پر مشتمل ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ من جانب اللہ ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی گھڑے ہوئے کلام میں یہ وصف پایا نہیں جاسکتا[۲]۔ اس موقع پر ذکر والے قرآن سے کیا مراد ہے؟ تو اس بارے میں امام رازیؒ تحریر کرتے ہیں کہ اس کی ایک توجیہ یہ ہے کہ وہ دو قسم کے بیانوں پر مشتمل ہے: وہ اگلے اور پچھلے تمام لوگوں کے قصوں (واقعات) پر مشتمل ہے اور دوسرے یہ کہ اس میں اصلی و فرعی (تمام) علوم کا بیان موجود ہے[۳]۔ اسی لئے ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہے:

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ کِتٰبًا فِیْہِ ذِکْرُکُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ (انبیاء : ۱۰)

ہم نے تمہارے پاس یقیناً ایک ایسی کتاب بھیج دی ہے جس میں تمہارا تذکرہ (یا تمہاری داستان) موجود ہے، کیا تم سمجھتے نہیں ہو۔

یہ خطاب پوری نوع انسانی سے اور ہر دور والوں کے لئے ہو سکتا ہے۔ اس اعتبار سے قرآن عظیم ہر دور والوں کے لیے ایک تذکرہ و تنبیہ یا ایک چونکانے والی چیز ہے، جو مختلف علوم و فنون کے بنیادی نکات پر مشتمل ہے اور اس کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ چنانچہ جدید تحقیقات و اکتشافات کی روشنی میں یہ "تذکرے" یا "تنبیہات" کھل کھل کر سامنے آتے رہیں گے۔ اسی لئے ارشاد باری ہے:

اِنْ ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَہٗ بَعْدَ حِیْنٍ (ص : ۸۷-۸۸)

یہ تو سارے جہاں کے لئے ایک تذکرہ (یا تنبیہ) ہے اور تم اس کی خبر کی صداقت) کچھ عرصے بعد ضرور جان لو گے۔

چنانچہ قرآن عظیم کی یہ پیش گوئی آج بخوبی پوری ہو رہی ہے اور اس میں مذکور حقائق جو اس کی "غیبی خبروں" کے روپ میں ہیں، وہ آج علوم و فنون کی روشنی میں بے نقاب ہوتے ہیں اور ان کا ایک تانتا سا بندھا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک معجزہ نما کلام ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔

نظام کائنات بھی تذکرہ و تبصرہ یہ تو کتاب الٰہی کا حال تھا، اب کائنات کی طرف آئیے تو دکھائی دے گا کہ مظاہر فطرت اور ان کے عجیب و غریب نظاموں میں ایسی بے شمار حکمتیں اور علمی دلائل سموئے گئے ہیں جو باری تعالیٰ کے "تخلیقی معجزات" کی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ انسانی عقل و دانش کے لئے ایک چیلنج بن کر سامنے آتے ہیں۔ انسان ان مظاہر و موجودات کی عقلی اعتبار سے توجیہ و تعلیل کرنے سے قاصر ہے۔ کیونکہ یہ مظاہر اور ان کی حیرت انگیز کارکردگی انسانی ذہن کی سمائی میں نہیں آسکتی۔ بالفاظ دیگر وہ خدائی تخلیق اور اس کی محیرالعقول کاریگری کو سمجھنے سے عاجز و بے بس ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر زمین کے پھیلاؤ

اس میں پہاڑوں کی تخلیق کے ذریعہ استحکام اور نباتات میں قانون زوجیت کے اجراء کو اپنی ربوبیت کی دلیل قرار دیتے ہوئے نوع انسانی کو خدائے تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی دعوت بالکل فطری اور خالص سائنٹفک انداز میں اس طرح دی ہے :

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَیْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِیْجٍ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ۔

(ق : ۷-۸)

ہم نے زمین کو (اس کی پوری گولائی میں) پھیلا دیا اور اس میں مضبوط پہاڑ ڈال دئے اور اس میں ہر قسم کے خوش نما زوج (نر و مادہ پھول) اگا دئے ہیں یہ سب (اللہ کی طرف) متوجہ ہونے والے ہر بندے کے لئے بصیرت اور یاددہانی کے طور پر ہے۔

واضح رہے مختلف قسم کے پیڑ پودوں میں جو اناج، پھل اور میوے وغیرہ نمودار ہوتے ہیں وہ نر پھولوں کے زردانوں (پالن گرینس) کے ذریعہ مادہ پھولوں کی بارآوری ہی کی بدولت ہے اور یہ حقیقت آج عصر جدید کی تحقیقات کی بدولت سامنے آتی ہے۔ اس کی تفصیل ہم نے اپنی بعض کتابوں میں کی ہے۔ یہ ربوبیت کا ایک نرالا اور حیران کن کرشمہ ہے۔ اسی وجہ سے بعض دیگر مواقع پر ارشاد ہے :

وَمِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۔

(ذاریات : ۴۹)

اور ہم نے ہر چیز میں جوڑے پیدا کر دئے تاکہ تم چونک سکو۔

وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْهٰرًا وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ۔

(رعد : ۳)

وہی ہے جس نے زمین کو (اس کی پوری گولائی میں) پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور دریا بنائے اور ہر قسم کے پھلوں میں نر و مادہ بنا دئے، وہ رات کو دن پر ڈھانپ دیتا ہے۔ ان مظاہر میں غور کرنے والوں کے لئے (قدرت خداوندی کی) نشانیاں موجود ہیں۔

وجود باری کے بعض دلائل ان آیات میں نباتات میں پائے جانے والے قانون زوجیت کا تذکرہ خصوصی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ چنانچہ جدید تحقیقات کی رو سے آج روئے زمین پر چار لاکھ سے زیادہ قسم کے پیڑ پودے پائے جاتے ہیں اور ان میں اس قانون کے مختلف روپ نظر آتے ہیں اور ان کے مادہ پھول نر پھولوں کے زیرہ دانوں سے بارآور ہوتے ہیں۔ اس عجیب و غریب مظہر ربوبیت کی تفصیل کے لئے علم نباتات (باٹنی) کی کوئی کتاب دیکھنی چاہئے۔ اس مختصر مضمون میں زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ مگر اتنا ضرور عرض کرنا ہے کہ نباتات کی ان مختلف اور حیرت انگیز کارکردگیوں کی مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے کوئی توجیہ نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ ان لاکھوں انواع حیات اور ان کے بے انتہا اختلافات کو محض "ارتقاء" کا نتیجہ قرار دینا ایک غیر عقلی اور غیر سائنٹفک نظریہ ہے، جسے دنیا کا کوئی بھی عقل مند قبول نہیں کر سکتا۔ نباتات کے ان اختلافات کو دیکھ کر ذہن میں اتنے سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا سائنٹفک نقطہ نظر سے کوئی تشفی بخش جواب ممکن نہیں ہوسکتا، بلکہ لامحالہ طور پر ایک خدائے واحد اور اس کی زبردست قدرت و خلاقیت کا

اقرار کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر اس سلسلے میں بعض سوالات اس طرح پیدا ہوتے ہیں: زمین سے اگنے والے پیڑ پودے مختلف رنگوں سے آراستہ کیوں ہوتے ہیں جو ایک ہی مٹی، ایک ہی پانی اور ایک ہی سورج کی روشنی میں پروان چڑھتے ہیں؟ ہر پیڑ پودا ایک مخصوص رنگ اور مخصوص ہیئت کے ساتھ کس طرح نمودار ہوتا ہے؟ نباتات میں بار آوری کے طریقوں کا اختلاف کیوں ہے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس بار آوری کے باعث حقیقتاً کیا عمل ہوتا ہے اور ہر پیڑ پودا اپنا مخصوص پھل اور پھول کس طرح تیار کر دیتا ہے؟ اس موقع پر جین اور کروموسوم کے نظریات سے ان مظاہر ربوبیت کی تسلی بخش توجیہ نہیں ہو سکتی جب تک کہ ایک قادر مطلق ہستی کا وجود تسلیم نہ کیا جائے اور پھر اس موقع پر ایک سوال یہ بھی ہے کہ جین اور کروموسوم میں اگر کوئی قانون ہے تو پھر اس قانون کو بنانے والا کون ہے؟ ظاہر ہے کہ بغیر کسی قانون ساز کے کوئی قانون خود بخود وجود میں نہیں آسکتا۔ کیونکہ بخت و اتفاق کے ذریعہ وجود میں آنے والی اشیاء میں قوانین نہیں ہوتے۔ لہذا بغیر کسی خالق و کارساز ہستی کے قوانین کا وجود تسلیم کرنا ایک غیر سائنٹفک بات ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر جین اور کروموسوم میں اپنے ماں باپ کی "وراثتی خصوصیات" پائی بھی جاتی ہیں تو ان کا خالق بھی باری تعالیٰ ہے۔ کیونکہ اس کا وجود مانے بغیر "انواعِ حیات" کے اختلافات کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس سلسلے میں مادہ پرست اور ارتقاء پسند لوگ عجیب و غریب تاویلیں کرتے ہیں، جیسے جین کی اچانک تبدیلی یا انحراف (میوٹیشن) وغیرہ۔ اس قسم کی نام نہاد اصطلاحات گھڑ کر وہ وجود باری کا انکار کرنا چاہتے ہیں، جو حقیقتاً شرک ہی کا ایک روپ ہے۔ گویا کہ وہ اس قسم کی اصطلاحات گھڑ کر خداوند قدوس کا "بدل" مہیا کرانا چاہتے ہیں۔ مگر وہ یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ جین بغیر کسی علت کے آخر

اس قدر "جست و خیز" کیوں کرتا ہے اور "بہتر سے بہتر" کی سمت میں کیسے آگے بڑھتا یا "ترقی" کرتا رہتا ہے؟ ایک اندھے بہرے مادے میں آخر اتنی "سوجھ بوجھ" اور منصوبہ بندی کہاں سے آگئی؟ کیا اس قدر نفیس منصوبہ بندی کا ظہور بغیر کسی منصوبہ ساز کے ممکن بھی ہو سکتا ہے؟ اس قسم کے بے شمار سوالات ہیں جن کا کوئی بھی جواب مادہ پرست لوگ نہیں دے سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدائے خلاق کے انکار کے سلسلے میں اس قسم کی "مادی تاویلات" کا سہارا لینا خدا کی خدائی میں دوسروں کو شریک کرنے ہی کے برابر ہے اور اس اعتبار سے موجودہ ملحد و مادہ پرست لوگ بھی درحقیقت مشرک ہیں، جو روایتی قسم کے مشرکین سے بھی زیادہ بدتر دکھائی دیتے ہیں۔ مگر ایک لحاظ سے روایتی مشرکین ان جدید مشرکین سے کچھ بہتر معلوم ہوتے ہیں جو کم از کم ایک خدائے برتر یا رب الارباب کا وجود تسلیم کرتے ہوئے اپنے معبودوں کو "چھوٹے خدا" قرار دیتے ہیں۔ جب کہ اس کے برعکس مشرکین جدید یا مادہ پرستوں کے نزدیک سوائے "مادہ" کے اور کسی خدا کا وجود ہی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑا شرک اور کیا ہو سکتا ہے؟

غرض اسی لئے مذکورہ بالا سورہ ق کی آیات میں ان مظاہر ربوبیت کو "ہر رجوع ہونے والے بندے کے لئے "تبصرہ و تذکرہ" کہا گیا ہے اور سورہ رعد میں فرمایا گیا ہے کہ ان مظاہر میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے دلائل ربوبیت موجود ہیں۔

حیات ثانی کا اثبات | بہر حال نباتات اپنی محیر العقول کارکردگیوں کی بنا پر نہ صرف باری تعالیٰ کے وجود اور اس کی بے مثال قدرت و ربوبیت کی دلیل ہیں بلکہ حیات ثانی یا قیامت کے موقع پر تمام انسانوں کے دوبارہ پیدا کئے جانے کا بھی ثبوت پیش کرتے ہیں۔

چنانچہ ایک موقع پر فرمان الٰہی ہے:

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ فِي الْأَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهُ حُطَامًا إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ۔
(زمر: ۲۱)

اے مخاطب! کیا تو نے مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ نے اوپر سے پانی برسایا اور اسے زمین میں چشمے بنا کر چلا دیا پھر وہ اس پانی کے ذریعہ رنگ برنگی کھیتیاں نکالتا ہے جو (بالآخر پک کر) زرد ہو جاتی ہیں، پھر وہ انہیں چورا چورا کر دیتا ہے؟ اس منظر (ربوبیت) میں پختہ عقل والوں کے لئے یقیناً ایک چونکا دینے والی چیز ہے۔

چنانچہ نباتات جس طرح اگتے ہیں اور اپنے شباب پر پہنچنے کے بعد زوال پذیر ہو کر ختم ہو جاتے ہیں اور پھر دوبارہ اگتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں اور وہ اپنا یہ پارٹ ہمیشہ دہراتے رہتے ہیں۔ اس طرح گویا کہ نباتات کی "حیات وممات" کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے یعنی ان کا چورا چورا ہو کر ختم ہو جانا اور پھر دوبارہ اپنی اصلی شکل وصورت میں نمودار ہونا حیات ثانی کی ایک واضح دلیل ہے۔ قیامت کے موقع پر سزا وجزا کے لئے انسانوں کو بھی اسی طرح دوبارہ ہو بہو اپنی شکل وصورت میں پیدا کیا جائے گا۔ نباتات جس طرح چورا چورا ہونے کے بعد دوبارہ جلوہ گر ہوتے ہیں، اسی طرح انسان بھی مٹی میں مل کر ریزہ ریزہ ہو جانے کے بعد پھر سے نمودار ہوں گے۔ ان دونوں میں کوئی عجوبہ نہیں بلکہ بہت بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ خدائے جبار وقہار کے لئے یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔

بہر حال نباتات کی زندگی حیات ثانی کی حقانیت پر دلیل ناطق ہے، چنانچہ اس حقیقت کو ایک دوسرے موقع پر اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ كَذَٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ۔
(اعراف: ۵۷)

وہی ہے جو ہواؤں کو خوش خبری بنا کر اپنی رحمت (بارش) سے پہلے بھیجتا ہے۔ یہاں تک کہ جب یہ ہوائیں بھاری بادلوں کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر لاتی ہیں تو ہم انہیں کسی مردہ زمین کی طرف ہانک دیتے ہیں پھر اس بادل کے ذریعہ پانی اتارتے ہیں، پھر اس پانی کے ذریعہ طرح طرح کے میوے نکالتے ہیں۔ اسی طرح (قیامت کے موقع پر) ہم مردوں کو بھی نکالیں گے (یہ مظاہر ہم اس لئے کر رہے ہیں) تاکہ تم (حیات ثانی کی حقانیت پر) متنبہ ہو سکو۔

احوال جنین سے استدلال

حیات ثانی یا قیامت کا عقیدہ چونکہ اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ایک ہے، اس لئے اس کی صحت وصداقت پر علمی اور سائنٹفک دلائل مختلف انداز میں لائے گئے ہیں۔ کیونکہ یہ عقیدہ انسان کو قابو میں رکھنے اور اس کے

گرد اور کیر کرٹر کو درست کرنے کے لئے ایک ہنٹر کا سا کام کرتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں علم جنین (ایمبریالوجی) کے بعض مباحث چھیڑ کر پوچھا گیا ہے کہ مرد کے جسم میں منی کون پیدا کرتا ہے؟ بڑھاپا کون طاری کرتا ہے؟ موت کس طرح واقع ہوتی ہے؟ انسان اپنی تخلیق اول (نطفے سے بتدریج جنین کی شکل اختیار کر لینے) سے واقف ہو چکا ہے تو وہ حیاتِ ثانی کی حقانیت تسلیم کیوں نہیں کرتا؟ ظاہر ہے کہ نطفے جیسی ایک رقیق اور حقیر چیز سے ایک پانچ چھ فٹ لمبے چوڑے انسان کا برآمد ہو جانا خود بخود نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ منی کے اندر پائے جانے والے جرثومے اور انسان میں کوئی مشابہت نہیں ہے۔ بلکہ یہاں پر ایک عظیم قوت و قدرت والی ہستی کا اثبات ہوتا ہے جو قیامت کے موقع پر اسی طرح اپنی قدرت کاملہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے مردہ انسانوں کو دوبارہ زندہ کر دے گا۔

نَحْنُ خَلَقْنَاكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ۔ اَفَرَاَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ۔ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الْخَالِقُوْنَ ۔ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ عَلٰۤى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ۔

(واقعہ: ۵۷-۶۲)

ہم نے ہی تم کو پیدا کیا ہے، تو تم اس بات کو سچ کیوں نہیں مانتے؟ اچھا ذرا بتاؤ تو سہی کہ جو منی تم (رحم مادر میں) ٹپکاتے ہو اسے آیا تم نے پیدا کیا ہے یا ہم نے؟ ہم نے ہی تمہارے درمیان موت مقرر کی ہے، لہذا ہم عاجز نہیں رہ سکتے اس بات سے کہ ہم تم جیسے لوگوں کو بدل دیں اور تمہیں ایسی شکل میں نکال کھڑا کر دیں جس کو تم نہیں جانتے۔ تم اپنی پہلی

تخلیق کو جان چکے ہو پھر تم متنبہ کیوں نہیں ہوتے؟

پہلی تخلیق سے مراد رحم مادر میں نطفے کا جنین کی شکل اختیار کرنا ہے جو ایک ننھے سے جرثومۂ حیات (منی میں پائے جانے والے سانپ نما کیڑے (اسپرماٹوزوا) اور عورت کے بیضے (اووم) سے مل کر مختلف مراحل (جیسے نطفے سے علقہ اور علقہ سے مضغہ وغیرہ) طے کرنے کے بعد ایک مکمل انسان کے روپ میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قدرت خداوندی کی کاریگری انسانی عمل کا نتیجہ نہیں ہے۔ لہذا جو ہستی ایک ننھے سے جرثومۂ حیات سے ایک مکمل انسان برآمد کر سکتی ہو اس کے لئے دوبارہ اسی طرح کا انسان پیدا کرنا کیا مشکل ہے؟ ظاہر ہے کہ منی میں پائے جانے والے ایک ننھے سے کیڑے یا جرثومے (اسپرماٹوزوا) اور ایک انسان میں کوئی مناسبت و مشابہت نہیں ہے۔ انسان کی جسمانی ہیئت اور اس کی اندرونی ساخت و پرداخت کا جائزہ لیجئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ اس کے اندر ایسے حیرت انگیز جسمانی و نفسیاتی نظامات پائے جاتے ہیں جن کی بنا پر اسے "عالم اصغر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی یہ پوری کائنات اپنی عجیب و غریب مشنری کی وجہ سے "عالم اکبر" ہے تو انسان عالم اصغر ہے، کیونکہ انسان کی اندرونی مشنری اس پوری کائنات کی مشنری سے زیادہ پیچیدہ اور محیر العقول ہے۔ گویا کہ وہ قدرت خداوندی کا ایک شاہکار اور عجوبہ روزگار ہے اور اس حیرتناک مظہر ربوبیت کی تخلیقی حقیقت و کیفیت اور اس کی کنہ و حقیقت عقل کی سمائی میں نہیں آ سکتی۔ بلکہ اس موقع پر ایک بے مثال قدرت والی ہستی کا وجود اور اس کی خلاقیت کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اسی لئے پوچھا گیا ہے کہ جب تم اپنی تخلیق اول سے آگاہ ہو چکے ہو تو پھر تمہیں تنبہ کیوں نہیں ہوتا کہ خلاق عالم اپنی قدرت کاملہ کے ذریعہ تمہیں دوبارہ اس طرح

پیدا کرے گا؟

حیات ثانی پر کلوننگ کی شہادت اس موقع پر یہ حقیقت بھی ملحوظ رہے کہ نباتات جس طرح بیجوں سے برآمد ہوتے ہیں، جو ایک رتی سی چیز ہیں، اسی طرح انسان بھی ایک رتی سی چیز (منی میں پائے جانے والے جرثومۂ حیات) سے برآمد ہوتے ہیں۔ اس طرح حیوانات و نبات میں بہت بڑی حد تک مشابہت پائی جاتی ہے۔ جب انسان مرنے کے بعد مٹی میں گل سڑ کر ختم ہو جائے گا تو اس کی دمچی (دم کے سرے پر پائی جانے والی ایک ہڈی) گلنے سڑنے سے محفوظ رہے گی جو ایک "بیج" کی طرح ہوگی۔ پھر قیامت کے موقع پر اللہ تعالیٰ اسی بیج سے دوبارہ ہو بہو وہی انسان برآمد کرے گا اور یہ حقیقت ایک حدیث میں اس طرح بیان کی گئی ہے: "جب کوئی انسان مر جاتا ہے تو اس کے سارے اعضا مٹی میں مل کر ختم ہو جاتے ہیں، سوائے دم کی ایک ہڈی (دمچی) کے، جس کے ذریعہ دوبارہ تخلیق عمل میں آئے گی"۔[۵۶] اور ایک دوسری حدیث میں بتایا گیا ہے کہ وہ دمچی رائی کے ایک دانے کی طرح ہے[۵۷]۔

یہ ایک خالص سائنٹفک دلیل ہے جو منکرین حق کے اذعان کے لئے کافی ہے۔ چنانچہ سائنسی تحقیق کے مطابق حیوانات و نباتات کے ہر خلیے (سیل) میں اس کی تمام نوعی خصوصیات پائی جاتی ہے اور منی میں پایا جانے والا جرثومۂ حیات بھی ایک خلیہ ہے۔ اسی طرح دمچی بھی ایک خلیہ ہو سکتی ہے، جسے رائی کے ایک دانے کے مانند کہا گیا ہے۔ لہذا عقلی اور سائنٹفک نقطۂ نظر سے ایک خلیے سے دوبارہ اسی قسم کا انسان برآمد کیا جانا کوئی تعجب خیز واقعہ نہیں ہے۔ جس کا انکار کر دیا جائے۔ چنانچہ آج "کلوننگ" (غیر ازدواجی عمل کے ذریعہ کسی خلیے سے مصنوعی طور پر کسی جانور کا ہم شکل برآمد کرنے) کے تجربے نے حیات ثانی کے عقیدے کی صحت

و صداقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے جیسا کہ کچھ عرصہ پہلے اسکاٹ لینڈ کے دو سائنس دانوں نے اس کا کامیاب تجربہ کر کے ایک مکمل بکری (ڈالی) مصنوعی طور پر ایک واحد خلیے سے برآمد کر لی۔ ظاہر ہے کہ جب انسان ایسا کر سکتا ہے تو پھر خدائے خلاق کیوں نہیں کر سکتا جو تمام انواع حیات کا خالق ہے؟ وقوع قیامت کی حقانیت پر اس سے بڑا سائنٹفک ثبوت اور کیا چاہیے؟[۵۸]

اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ. وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ. قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ۔ (یٰس: ۷۷-۷۹)	کیا انسان نے مشاہدہ نہیں کیا کہ ہم نے اسے نطفے (جیسی حقیر چیز) سے پیدا کیا ہے؟ مگر وہ (قیامت کے بارے میں) کھلم کھلا جھگڑنے لگا ہے اور اس نے ہماری شان میں گستاخی کی اور اپنی اصلیت کو بھول کر کہنے لگا کہ ان ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا جو بوسیدہ ہو چکی ہیں؟ کہدو کہ ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے انہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے اور وہ اپنی تمام مخلوق کو بخوبی جانتا ہے۔

نظام کائنات داعی الی اللہ چونکہ یہ کائنات اور اس کے مظاہر اندھا دھند طور پر یا روا روی میں پیدا نہیں کئے گئے ہیں۔ بلکہ ان کی تخلیق و آفرینش انتہائی حکمت و مصلحت کے ساتھ کی گئی ہے، اس لئے یہاں قدم قدم پر وجود باری اور اس کی خلاقیت و ربوبیت پر

متنبہ کرنے اور چونکا دینے والی چیزیں ملتی ہیں، جن کو "آیات" یا خدائی نشانات و دلائل کہا گیا ہے اور ان حقائق و معارف کا مطالعہ اگر کھلے ذہن و دماغ کے ساتھ کیا جائے تو انسان کو خدا کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں رہ جاتا، اسی لئے قرآن حکیم میں جگہ جگہ متعدد مظاہر عالم اور ان کے حیرت انگیز نظاموں کا تذکرہ کر کے نوع انسانی کو خدا کی طرف راغب ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر آسمان کی وسعت، زمین کی فرشیت اور قانون زوجیت کا تذکرہ اس انداز میں کیا گیا ہے کہ گویا یہ مظاہر قدرت خداوندی اور اس کی خلاقیت کا واضح ثبوت ہیں:

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ۔

(ذاریات: ۴۸: ۵۱)

آسمان کو ہم نے اپنی قدرت سے پیدا کیا اور اس میں ہم (برابر) وسعت دئے جا رہے ہیں اور زمین کو ہم نے (اس کی پوری گولائی میں ایک فرش کی طرح) پھیلا دیا ہے تو ہم کیا ہی بہتر پھیلانے والے ہیں اور ہم نے ہر چیز کا جوڑا (نر اور مادہ) بنا دیا ہے تاکہ تم چونک سکو۔ لہذا (ان مظاہر کے ملاحظے سے) اللہ کی طرف دوڑو، میں اس کی طرف سے تمہیں کھلے طور پر ڈرانے والا ہوں۔

اسی طرح ایک دوسرے موقع پر آسمان میں بروج یا کہکشاؤں کی تخلیق، آفتاب و ماہتاب

کی آفرینش اور دن رات کو ایک دوسرے کے پیچھے تسلسل کے ساتھ آنے جانے کو دلائل ربوبیت کے طور پر پیش کرتے ہوئے ایک دوسرے اسلوب میں دعوت الی اللہ اس طرح دی گئی ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا (فرقان: ۹۱-۹۲)

بڑا ہی بابرکت ہے وہ جس نے آسمان میں (بہت سے) بروج بنا دئے اور ان میں ایک چراغ (سورج) اور ایک منور چاند بنا دیا اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والا بنا دیا، اس شخص کے لئے جو (ان حیرتناک مظاہر کو دیکھ کر) متنبہ ہو یا وہ شکرگزار بننے کا ارادہ کرے۔

آگ ربوبیت کا ایک شاہکار ایک اور موقع پر آگ کو ربوبیت کا ایک تخلیقی معجزہ اور یادگار شے قرار دیتے ہوئے ارشاد باری ہے:

اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ

اچھا ذرا بتاؤ تو سہی کہ جس آگ کو تم جلاتے ہو اس کے درخت کو آیا تم نے پیدا کیا ہے یا اسے ہم پیدا کرنے والے ہیں؟ ہم نے اسے ایک یادگار اور سفر کرنے والوں کے لئے ایک فائدہ مند چیز بنا دی ہے۔

الْعَظِیْمِ (واقعہ: ۷۱-۷۴) لہذا تم اپنے زبردست رب کے گن گاؤ

اس موقع پر سائنسی نقطہ نظر سے چند باتیں قابل توجہ ہیں: اول یہ کہ آگ بذات خود کیا چیز ہے؟ تو وہ دراصل ایک ایسا جلنے والا عنصر (کاربن) ہے جو دیگر عناصر کے ساتھ مٹی میں ملا ہوا ہے مگر زمین کی مٹی میں پائے جانے والے اس عنصر کو دیگر عناصر سے الگ کرکے جلانا ممکن نہیں ہے جب تک کہ وہ درختوں کی شکل میں نمودار نہ ہوجائے۔ لہذا خلاق عالم نے اس کا انتظام اس طرح کیا کہ حیوانات کے ذریعہ خارج ہونے والی کاربن ڈائی آکسائیڈ کو نباتات کی غذا بنایا جو فضا کے ذریعہ کاربن ڈائی آکسائیڈ کے سالمے (مالی کیول) کو اخذ کرکے کاربن کو خود اپنے استعمال کے لئے رکھ لیتے ہیں اور آکسیجن کو واپس فضا میں بھیج دیتے ہیں۔ پھر اس آکسیجن کو حیوانات سانس کے ذریعہ اپنے جسموں کے اندر داخل کرکے کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتے ہیں۔ حیوانات اور نباتات کے اس دوطرفہ عمل کو "کاربن کا چکر" (کاربن سائیکل) کہا جاتا ہے اور اس سے فضا میں آکسیجن کا تناسب قائم رہتا ہے اور یہ نقاش فطرت کی بہت بڑی حکمت تخلیق ہے۔ غرض اس عمل کے ذریعہ درختوں میں مسلسل کاربن جمع ہوتی رہتی ہے جو غذائی اجناس اور پھلوں میں نشاستے (کاربوہائیڈریٹ) کے روپ میں نمودار ہوکر حیوانات کی غذا بنتی ہے۔ چنانچہ پھلوں اور میووں کا اکثر حصہ کاربن ہی پر مشتمل ہوتا ہے۔ چنانچہ سائنسی تحقیق سے (لیبورٹریوں میں کیمیائی تحلیل وتجزیے کے ذریعہ) ثابت ہوچکا ہے کہ نشاستہ دراصل پانی اور کاربن کا آمیزہ ہے جو سالمے (مالے کیول) کی شکل میں ہوتا ہے۔ قشر ارض میں کاربن کی مقدار بیس فیصد ہے جب کہ فضا میں اس کی مقدار صرف ۰۳ء۰ فیصد ہے اور خشک درختوں کی تقریباً نصف مقدار کاربن پر مشتمل ہوتی ہے، جس کی وجہ سے لکڑی اور کوئلہ دھڑا دھڑ جلنے لگتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ آگ ایک ایسی پوشیدہ قوت ہے جو عقلی اعتبار سے انسان کی

حیرانی کا باعث ہے کہ آخر وہ ہے کیا چیز؟ اور وہ کس طرح نمودار ہوتی ہے؟ انسان تو صرف اتنا ہی جانتا ہے کہ کسی چیز کو جلانے سے شعلوں کی شکل میں ایک چیز پیدا ہوتی ہے جس میں گرمی، حرارت اور روشنی ہوتی ہے اور بس۔ اس سے آگے وہ کچھ بھی نہیں جانتا کہ یہ گرمی وحرارت جو اس میں پوشیدہ تھی آخر وہ کیا چیز ہے؟ راقم کا خیال ہے کہ شاید عناصر میں موجود الکٹرانوں اور پروٹانوں میں پائی جانے والی منفی ومثبت بجلی کے ظہور کی وجہ سے ایسا ہوتا ہوگا۔ مگر اس کے برعکس بہت سے عناصر ایسے ہیں جو جلتے نہیں حالانکہ تمام عناصر بنیادی طور پر الکٹرانوں اور پروٹانوں کا مجموعہ ہیں۔ اس حیثیت سے یہ ایک راز ربوبیت ہے جس کی حقیقت انسان نہیں جانتا۔ اسی لئے اس موقع پر اسے "ایک متنبہ کرنے والی اور یادگار شے" قرار دیا گیا ہے۔ ایک دیدۂ بینا جب آگ کو دیکھتا ہے تو اسے لامحالہ طور پر ایک محیر العقول اور انوکھی قدرت والی ہستی کی یاد آجاتی ہے۔

تیسری حقیقت یہ ہے کہ آگ جلانے کے لئے بڑے اہتمام کی ضرورت پڑتی ہے ورنہ کاربن اگر خود بخود آگ پکڑ لیتا تو اس سے انسان بڑی مشکل میں پڑ جاتا، بلکہ اس کا جینا دوبھر ہوجاتا۔ لہذا رب العالمین نے انسان کو آگ کے مضر اثرات سے محفوظ رکھنے کی غرض سے آگ کو قابو میں رکھا ہے۔ اس اعتبار سے آگ بھی وجود باری اور اس کی حکمت تخلیق کی ایک ناقابل تردید دلیل ہے ورنہ جو چیز از خود وجود میں آجائے اس میں اس قدر مصالح کس طرح جمع ہوسکتے ہیں۔

اس سلسلے میں چوتھی حقیقت یہ ہے کہ آگ سفر کرنے والوں کے لئے ایک مفید ترین ایندھن ہے اور موجودہ تمدنی دور میں بھی اس کی اہمیت بالکل مسلم ہے۔ چنانچہ عصر جدید میں نئی نئی سواریوں میں جو ایندھن پٹرول اور ڈیزل کی شکل میں استعمال ہوتا ہے جیسے موٹر، کار، ریل اور ہوائی جہاز وغیرہ، وہ بھی درختوں ہی کی دین ہے، جو سائنسی نقطہ نظر سے لاکھوں سال پہلے درختوں سے بھرے

ہوئے جنگلات کے زمین کے اندر دھنس جانے کی وجہ سے ان کے عرق کے طور پر پیدا ہو سکا ہے۔ اس اعتبار سے آگ اور درخت میں بہت گہرا تعلق ہے۔

غرض ان تمام اعتبارات سے آگ ربوبیت کا ایک شاہکار اور ایک یادگار چیز ہے۔ اسی لئے اس موقع پر خدائے عظیم کی تسبیح بیان کرنے اور اس کی عظمت و برتری کے گن گانے کا حکم دیا گیا ہے جو انتہائی شفیق و مہربان ہے کہ اس نے انسان کی تمدنی ترقی کے لئے اس قدر مفید اور فائدہ بخش چیز پیدا کی۔ لہذا انسان کو چاہئے کہ وہ بطور احسان مندی اور شکرگزاری اپنے اس رب عظیم کے حضور میں سر بسجود ہو کر اس کے حکموں کی تعمیل کرے۔

قرآن کتاب دلائل و براہین

بہر حال قرآن حکیم میں کائنات کے ان تمام مظاہر کو "آیات" یا دلائل ربوبیت کے طور پر انسان کے سامنے لانے اور اسے متنبہ کرنے کا تذکرہ اس طرح آیا ہے:

هُوَ الَّذِي يُرِيكُمْ آيَاتِهِ وَيُنَزِّلُ لَكُم مِّنَ السَّمَاءِ رِزْقًا وَمَا يَتَذَكَّرُ إِلَّا مَن يُنِيبُ (مومن: ۱۳)

وہی ہے جو تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے اور تمہارے لئے آسمان سے رزق اتارتا ہے۔ ان حقائق پر وہی متنبہ ہو سکتا ہے جو اللہ کی طرف رجوع کرنے کا داعیہ رکھتا ہو۔

اس قسم کی اور بھی متعدد آیات کلام الٰہی میں موجود ہیں جو انسان کو عبرت و بصیرت کی دعوت دیتی ہیں۔ اس اعتبار سے قرآن عظیم دلائل و براہین کی کتاب ہے جو نوع انسانی کو تعصب کی عینک ہٹا کر عقل و بصیرت سے کام لینے اور اپنا نفع و نقصان پہچان کر صحیح راستہ اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے اور اس سلسلے میں کسی قسم کے جبر و اکراہ کو روا نہیں رکھتا۔

کیونکہ دلیل و استدلال کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ بغیر کسی دباؤ کے اپنی مرضی سے راہ ہدایت کا انتخاب کرے۔ چنانچہ اس کتاب حکمت میں ایک موقع پر بہت سے مظاہر کائنات کا تذکرہ کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

قَدْ جَاءَكُم بَصَائِرُ مِن رَّبِّكُمْ فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا وَمَا أَنَا عَلَيْكُم بِحَفِيظٍ (انعام: ۱۰۴)

(اے لوگو) تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے بصیرت کی باتیں آچکی ہیں، تو اب جس نے انہیں (بنظر عبرت) دیکھا تو اس کا فائدہ اسی کو ہوگا اور جو اندھا بنا تو اس کا وبال بھی اسی پر ہوگا (اور کہدو کہ) میں تم پر نگراں نہیں ہوں۔

قرآن سارے جہاں کے لئے ایک انتباہ

خلاصہ یہ کہ قرآن اور کائنات ایک دوسرے کے لئے تذکرہ و تبصرہ ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں علم و حکمت سے بھرپور ہیں اور ان دونوں میں "الحق" سمو دیا گیا ہے، جس کی بنا پر وہ ایک دوسرے کی تائید و تصدیق کرتے ہیں اور ان دونوں کی مطابقت سے بگڑے ہوئے انسانوں کی رہنمائی ہوتی ہے، جس کی بنیاد دلیل و استدلال پر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عقلی و علمی طریقۂ دعوت ہے جو نوع انسانی کی عقل و منطق اور اس کے ذہن و دماغ سے اپیل کرتا ہے۔ اس اعتبار سے کتاب الٰہی فطری اور سائنٹفک طرز فکر کو اپناتے ہوئے انسان کے دل و دماغ کو جھنجھوڑتی ہوئی اس کے ذہنی دریچوں کو کھول دیتی ہے اور یہ دعوت فکر یقیناً بہت موثر اور دوررس نتائج کی حامل ہے جس کی موجودہ سائنسی دور میں بہت زیادہ اہمیت ہے۔

اس بحث سے یہ ثابت ہوتا کہ قرآن عظیم عصر جدید کے مزاج اور اس کے تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے اور وہ جدید سے جدید تر تمام تحقیقات کا مقابلہ بخوبی کرتے ہوئے ہر دور میں نوع انسانی کی ہدایت و رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکتا ہے اور یہ عظیم ترین وصف بھی اس کے من جانب اللہ ہونے کی ایک اور ناقابل تردید دلیل ہے اسی لئے اسے سارے جہاں کے لئے تنبیہ و انتباہ قرار دیا گیا ہے:

تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا (فرقان: ۱)	بڑا ہی بابرکت ہے وہ جس نے اپنے بندے پر فرقان (حق و باطل میں تمیز کرنے والی کتاب) اتاری تاکہ وہ سارے جہاں کو متنبہ کر سکے۔

قرآن سارے جہاں کے لئے تنبیہ و تذکیر کا ذریعہ اسی وقت قرار پا سکتا ہے جب کہ خود اس میں سارے جہاں کے مزاج اور اس کی اندھی عقلیت کے توڑ کا سامان موجود ہو اسی وجہ سے قرآن کو برہان (دلیل و حجت) بھی کہا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُبِينًا۔ (نساء : ۴، ۱۷۴)	اے لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے دلیل آچکی ہے اور ہم نے تمہارے پاس ایک نور روشن (قرآن) بھیج دیا ہے۔

بہرحال قرآن عظیم اپنے علمی و عقلی دلائل و براہین اور اس کے علمی اسرار و حقائق کے لحاظ سے بھی ایک معجزہ ہے جو ہر دور کی ذہنیت و عقلیت کا بخوبی مقابلہ کرتے ہوئے اپنا رہبرانہ کردار برابر ادا کرتا رہے گا۔ وہ ہمیشہ تازہ اور سدابہار رہے گا اور اس کی تعلیمات کو

کبھی زوال نہیں آسکے گا۔ کیونکہ وہ رب العالمین کا کلام ہے جو سارے جہاں کا خالق اور رب ہے اور اس کی نظروں سے دنیا کی کوئی چیز اور کوئی بھید پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ قیامت تک پیش آنے والے تمام احوال و کوائف سے آگاہ اور اپنے بندوں کے حالات پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ اسی بنا پر اس نے بطور پیش خبری ہر دور کے تقاضے کے مطابق دلائل و براہین اپنی کتاب حکمت میں پہلے ہی سے درج کر دیے ہیں، جو اس کی بے مثال ہمہ دانی کا ایک ناقابل تردید ثبوت ہے۔ ظاہر ہے کہ مستقبل کے حالات کے پیش نظر اتنا جامع اور کامل نظام دلائل کوئی ایک انسان تو کیا ماہرین کی ایک پوری ٹیم بھی وضع نہیں کر سکتی، جو ہر دور کے احوال و کوائف کے مطابق پوری طرح فٹ ہو جائے اور اس کا کوئی دعویٰ غلط ثابت نہ ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن عظیم کے دعوے اور اس کے دلائل جدید تحقیقات کی روشنی میں کھل کھل کر اور نکھر کر سامنے آرہے ہیں اور اس کی صداقت و حقانیت کے نئے نئے ابواب وا ہو رہے ہیں۔ صداقتوں یا سائنٹفک ثبوتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو صف باندھے ہوئے سامنے آرہا ہے تو کیا نوع انسانی کے یقین و اذعان کے لئے یہ دلائل کافی نہیں ہیں؟ تو کیا نوع انسانی کے لئے مختلف قسم کے "تذکروں" یا دلائل ربوبیت سے بھرپور کتاب پر ایمان لانے اور اپنی عاقبت سنوارنے کا وقت ابھی نہیں آیا؟ اب اسے کس بات کا انتظار ہے اور مزید کس قسم کی دلیل کی ضرورت ہے؟ خالق کائنات کی بات اور اس کی دلیل و حجت سے بڑھ کر کس کی دلیل ہو سکتی ہے؟ اسی لئے فرمایا گیا ہے:

أَوَلَمْ يَنْظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا	کیا ان لوگوں نے زمین اور آسمانوں کی بادشاہت اور اللہ کی تخلیقات میں

خَلَقَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ وَّاَنْ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُھُمْ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ (اعراف : ۱۸۵)

غور نہیں کیا؟ اس بنا پر ہو سکتا ہے کہ ان کا وقت قریب آچکا ہو۔ تو وہ اس (کلام برتر) کے بعد آخر کس چیز پر ایمان لائیں گے؟

وَیْلٌ لِّکُلِّ اَفَّاکٍ اَثِیْمٍ یَّسْمَعُ اٰیٰتِ اللّٰہِ تُتْلٰی عَلَیْہِ ثُمَّ یُصِرُّ مُسْتَکْبِرًا کَاَنْ لَّمْ یَسْمَعْھَا فَبَشِّرْہُ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰیٰتِنَا شَیْئًا اتَّخَذَھَا ھُزُوًا اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ۔ (جاثیہ : ۷-۹)

خرابی ہے ہر اس شخص کے لئے جو (آیات الٰہی کو جھٹلانے والا اور گنہگار ہے۔ وہ اللہ کی آیات کو جو اسے پڑھ کر سنائی جاتی ہیں سننے کے باوجود تکبر کرتے ہوئے (انکار الٰہی پر ہی) اصرار کرتا ہے۔ تو ایسے شخص کو ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنادو (چنانچہ) اسے ہماری نشانیوں میں سے کسی بات کا علم ہوتا ہے تو وہ ان کا مذاق اڑانے لگتا ہے۔ تو ایسے لوگوں کے لئے ذلت بھرا عذاب ہوگا۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ وَمَا یَکْفُرُ بِھَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ (بقرہ : ۹۹)

یقیناً ہم نے آپ کے پاس روشن دلائل بھیج دئے ہیں اور ان کا انکار بدکردار لوگ ہی کر سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ دلائل کی روشنی میں جو حق بات واضح ہو رہی ہو اسے تسلیم نہ کرکے فسق وفجور ہی پر اڑے رہنا انتہائی بدبختی ہے اور ایسے فاسق وفاجر لوگوں کو دنیا کی کوئی طاقت زبردستی راہ راست پر نہیں لا سکتی۔ اللہ تعالیٰ ہدایت اسی کو دیتا ہے جو ہدایت کا طالب بھی ہو۔

وَکَذٰلِکَ اَنْزَلْنٰہُ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ وَّاَنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یُّرِیْدُ۔ (حج : ۱۶)

اسی طرح ہم نے اس (قرآن) کو کھلے ہوئے دلائل کے ساتھ بھیجا ہے اور اللہ اسی کو ہدایت دیتا ہے جو (ہدایت کا) ارادہ کرتا ہو۔

لہٰذا ہدایت یافتہ بننے کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ فسق وفجور کو ترک کیا جائے۔

مراجع

[1] دیکھئے معجم الفاظ القرآن الکریم، مطبوعہ مصر [2] دیکھئے التبیان فی اقسام القرآن، ص ۸، دار الکتاب العربی مصر [3] تفسیر کبیر: ۲۶/۱۷۶، دار الفکر بیروت، ۱۴۱۳ھ [4] اس موقع پر تفصیلی بحث کے لئے راقم کی کتاب "قرآن حکیم اور علم نباتات" ملاحظہ ہو [5] بخاری: ۶/۷۹، مطبوعہ استانبول، مسلم ۴/۲۲۷۱ مطبوعہ ریاض [6] دیکھئے فتح الباری، از حافظ ابن حجر: ۸/۵۵۲، مطبوعہ دار الافتاء، ریاض [7] اس موضوع پر مزید تفصیل کے لئے راقم کی کتاب "قرآن اور نظام فطرت" دیکھنی چاہئے۔

فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کا سالِ وفات

از جناب فیروزالدین احمد فریدی*

فریدالدین مسعود گنج شکر (بابا صاحب) تیرھویں صدی عیسوی کی چھٹی دہائی میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد، ان کی جائے ولادت کی طرح، ان کے سالِ وفات کے بارے میں بھی، آج تک، یعنی پچھلے سوا سات سو برسوں کے دوران، مختلف اور بعض اوقات متضاد روایات گردش کرتی رہی ہیں۔ ان متضاد روایات کا سب سے حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ بہت سے علماء اور مؤرخین نے، جن میں قدیم اور جدید کی تخصیص نہیں، اپنی کتابوں اور مضامین میں، اگر ایک صفحے پر کوئی سنہ (مثلاً ۶۶۴ھ) بابا صاحب کے سالِ وفات کے طور پر لکھا، تو اسی تحریر کے کسی دوسرے صفحے پر (اور ''تاریخ فرشتہ'' میں تو اسی صفحے پر)، ۶۶۴ھ کے بعد کسی اور سنہ (مثلاً ۶۶۹ھ) کا بھی یہ کہہ کر ذکر کر ڈالا کہ بابا صاحب اس مؤخرالذکر سنہ میں زندہ تھے۔ اگر یہ بدیہی تضاد کسی ایک کتاب میں ہوتا تو نظرانداز کر دیا جاتا لیکن جب گزشتہ سات صدیوں کے دوران، جدید اور قدیم، مطبوعہ اور قلمی سب ہی کتابوں میں یہ ہوتا چلا آرہا ہو تو یہی خیال آتا ہے کہ شاید کسی پُر اسرار وجہ سے، بابا صاحب کے سالِ وفات کے گرد نظر بندی کا ایسا حصار کھینچ دیا گیا کہ دیکھنے والے، دیکھنے کے باوجود، نہ دیکھ سکے بلکہ اپنے قلم سے اِن تضادات کو اپنی تحریروں میں دہراتے رہے۔

جائے ولادت کے مسئلے پر چھائی ہوئی دھند تو اب اُن کے محبوب خلیفہ، محبوبِ الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء کی رہنمائی میں چھٹ گئی ہے، کیا عجب کہ اکیسویں صدی کے آغاز میں اب وہ گھڑی بھی آگئی ہو جب بابا صاحب کے سالِ وفات پر چھائی ہوئی دھند بھی چھٹ جائے۔ ہر کام کا وقت مقرر ہے۔

* کھٹوال ہاؤس۔ ۵۴۔ اے اسٹریٹ نمبر ۱۵ گلشنِ فیصل۔ باتھ اسلانڈ۔ کراچی

زیرِ نظر مضمون میں بابا صاحب کے سالِ وفات کے بارے میں روایات یکجا کرنے کی ایک کوشش کی گئی ہے۔ جس میں بعض جگہ راقم سطور نے اپنی خام رائے اور تبصرے بھی شامل کر دیے ہیں۔ یہ روایات نقل کرنے اور ان خام تبصروں کے اظہار میں جہاں غلطی ہوئی ہو اور غالباً جگہ جگہ ہوئی ہوگی، اس مضمون کے قارئین ان سے درگزر کر کے ان کی نشان دہی کریں تاکہ ان کی تصحیح ہو اور تحقیق آگے بڑھے جو اس تحریر کا محرک ہے۔

بابا صاحب کے سالِ وفات کے بارے میں چار بنیادی سوالات یہ ہیں:۔

۱۔ اکثر عالمانہ کتابوں اور محققانہ مضامین میں، بابا صاحب کا سالِ وفات ۶۶۴ھ (مطابق ۱۲۶۵ء) لکھا گیا ہے، اس کا ماخذ کیا ہے؟

۲۔ کیا ۶۶۴ھ (مطابق ۱۲۶۵ء) صحیح سالِ وفات ہے؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں؟

۳۔ ۶۶۴ھ (مطابق ۱۲۶۵ء) کے علاوہ، بابا صاحب کے سالِ وفات کے بارے میں کیا روایتیں مشہور ہیں؟ اور وہ کن سے منسوب ہیں؟

۴۔ صحیح سالِ وفات کیا ہو سکتا ہے؟ اور اس کی تائید میں کیا اسناد و شواہد ہیں؟

۱۔ سالِ وفات ۶۶۴ھ کا ماخذ

بابا صاحب کی تاریخِ وفات بالاتفاق پانچ محرم ہے، جس کا ماخذ، اور جس کی سند، خواجہ نظام الدین اولیا کے ملفوظاتِ عالیہ ہیں جو ان کے مرید امیر حسن علاء سجزی نے، ۷۰۷ھ سے ۷۲۲ھ (مطابق ۱۳۰۸ء سے ۱۳۲۲ء) کے درمیان، ''فوائد الفواد'' میں ریکارڈ کیے۔ یہ سات سو سالہ پرانے ملفوظات اتنے مستند تسلیم کیے جاتے رہے ہیں کہ ان کی بنا پر بابا صاحب کی تاریخِ وفات پر کبھی کوئی اختلاف نہیں رہا، گو جیسا کہ اس مضمون میں آگے لکھا گیا ہے، بعض کتابوں میں جو بیسویں صدی عیسوی میں شائع ہوئیں، مصنف، کاتب یا پُروف ریڈر کی سہو سے، بابا صاحب کی متفقہ تاریخِ وفات بھی غلط لکھ دی گئی۔ اِسی سہو کی بنا پر یہ قوی شبہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں بابا صاحب کے سالِ وفات کے بارے میں صدیوں سے پایا جانے والا یہ اختلاف بھی کسی مصنف، کاتب یا پُروف ریڈر کی سہو کا نتیجہ تو نہیں جس نے بے خیالی میں مثلاً لفظ ''سبع'' کو ''تسع'' لکھ دیا ہو۔

تاریخِ وفات پر اتفاق کی بنیاد تو معلوم ہوگئی، سالِ وفات پر عدمِ اتفاق کی سب سے بڑی وجہ بھی، بادی النظر میں، یہی لگتی ہے کہ سالِ وفات کا ذکر ''فوائد الفواد'' میں نہیں۔ اس کی توجیہ یہ ہے کہ

"فوائد الفواد" کے پندرہ برس پر محیط یہ ملفوظات غیر رسمی نشستوں میں ہونے والی وہ دل نشیں گفتگو ہے جس کا واحد مقصد روحانی رہنمائی تھا، نہ کہ سوانح نگاری یا تاریخ نویسی۔ مشاہدے اور تجربے کی بات ہے کہ جب ہم اپنی غیر رسمی گفتگو میں، کسی عزیز کی موت کا ذکر کرتے ہیں تو وفات کے وقت، دن یا تاریخ کا ذکر تو آتا ہے لیکن سال یا صدی کا کبھی نہیں۔ اگر غیر رسمی گفتگو میں، کسی عزیز کی موت کا ذکر کرتے ہوئے، وفات کے سال یا وفات کی صدی کا ذکر آنے لگے تو یہ نہ صرف انتہائی رسمی بلکہ غیر فطری لگے گا۔ اس نوع کا ذکر بات چیت میں نہیں بلکہ رسمی تحریر میں ہوتا ہے اور یہ تحریریں مؤرخوں اور سیرت نگاروں کی ہوتی ہیں، روحانی پیشواؤں کی نہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ مؤرخوں اور سیرت نگاروں نے بابا صاحب کے سالِ وفات کے بارے میں کیا لکھا۔

گزشتہ صدیوں میں، جب نہ کمپیوٹر تھا، نہ چھاپے خانے، کتابیں لکھنے کے دو طریقے ہو سکتے تھے۔ اولاً مصنف اپنے ہاتھ سے کتاب کا پہلا مسودہ لکھتا ہوگا اور بعد میں کاتب اسے نقل کرتے ہوں گے۔ ثانیاً مصنف کسی کاتب کو کتاب کی املا کرا دیتا ہوگا اور کتاب کی کتابت کاتب کرتے ہوں گے، گویا زورِ قلم مصنف کا اور قلم کاتب کا۔ اب "کاتب" کو کمپیوٹر پڑھیں۔ صدیوں پہلے کتابت شدہ کتابوں کے جو قلمی نسخے اب تک موجود ہیں، ان کے بارے میں اگر آج وثوق سے یہ کہا جا سکتا کہ وہ عہدِ قدیم کے مصنف کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے ہیں، یا یہ کہ کاتب سے کتابت کرانے کے بعد، مصنف نے مسودے کو پڑھ کر اسے درست قرار دیا تو حقائق کی صحت کا ذمہ دار مصنف ہوتا، لیکن اگر یہ قدیم قلمی نسخے کاتبوں کے ہاتھوں سے نکلی ہوئی نقول، بلکہ نقلوں کی نقلیں، ہوں جو مصنف کی وفات کے بعد صدیوں سے نقل کی جا رہی ہوں تو ان کے اندر، خصوصاً چند اعداد یا بعض الفاظ کے اندر، پائی جانے والی سہو کا ذمہ دار ضروری نہیں کہ مصنف ہو بلکہ عین ممکن ہے کہ کوئی کاتب ہو۔

اگر کتاب مصنف کے اپنے ہاتھ سے بھی لکھی گئی ہو، تب بھی پانچ باتوں پر غور کرنا ضروری ہے۔ اولاً بڑے سے بڑے مصنف سے بھی دورانِ تحریر کوئی سہو ہو سکتا ہے۔ کتابوں کی بات چھوڑیے، بعض اوقات خط میں کوئی سہو ہو جائے تو صاحبِ تحریر، نظرِ ثانی کے دوران، اسے نہیں پکڑ پاتا۔ شاید یہ سہو مکرر، انسانی نفسیات کے اس پہلو کا عکاس ہو کہ انسان کی نظر اپنی غلطی پر کم ہی پڑتی ہے یا پھر اس بات کا مظہر ہو کہ مصنف اپنی تحریر، اپنی آنکھوں سے نہیں بلکہ اپنے دماغ سے پڑھتا ہے۔

ثانیاً ہر کتاب کی تصنیف کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ اگر مقصد کسی کی پیدائش یا موت کا سال بتانا

ہو تو مصنف کی توجہ ان سنین کی صحتِ بیان پر مرکوز ہوگی لیکن اگر مقصد کسی کی سیرت، کسی کا پیغام یا کسی کے بارے میں کوئی اہم واقعہ بیان کرنا ہو تو مصنف کی توجہ اس پر رہے گی، نہ کہ ان سنین پر جن میں یہ بات کہی گئی ہو یا وہ واقعہ رونما ہوا ہو۔ اگر سنین کا ذکر آئے گا تو مصنف کی توجہ کا مرکز سنین کی صحتِ اندراج نہیں بلکہ سیرت یا واقعات کا صحتِ بیان ہوگا۔

ثالثاً، زمانہ قدیم میں، کسی قلمی کتاب کا نسخہ سامنے رکھ کر، کاتب حضرات جن میں سے بیشتر، آج کی طرح، معاوضے پر کتابت کرتے تھے، جب کتابت کرنے بیٹھتے تھے تو عین ممکن ہے کہ کسی ضخیم کتاب کے اوراق کو، صبح سے شام تک نقل کرتے ہوئے، ان سے کہیں کوئی فقرہ چھوٹ جاتا ہو یا فقرے رہ جاتے ہوں، کہیں کوئی حرف یا لفظ ادل بدل ہو جاتا ہو اور اعدادی غلطیوں میں اس قسم کے سہو دیکھنے کے لیے ہمیں زمانہ قدیم کی کتب کو کھنگالنے کی ضرورت نہیں بلکہ اسی عہد میں بابا صاحب کی دو سوانح ہائے حیات کی دو مثالیں کافی ہیں جن کا تفصیلی ذکر بعد کے صفحات میں آئے گا۔ ایک میں جو لاہور کے ایک خاصے جانے پہچانے اشاعتی ادارے نے شائع کی ہے، بابا صاحب کی تاریخِ وفات "پانچ" محرم کی بجائے "نو" محرم لکھی ہے۔ دوسری میں، ملتان سے تعلق رکھنے والے ایک جانے پہچانے معلم اور مؤرخ نے بابا صاحب کی تاریخِ وفات نہ صرف "پانچ" کی بجائے "نو" لکھی بلکہ "نو محرم" کی بجائے "نو/اکتوبر ۶۶۴ھ" لکھ ڈالی، حالاں کہ ہجری تقویم میں اکتوبر کا مہینہ نہیں ہوتا۔ جب ایسی غلطیاں بیسویں صدی عیسوی میں ہو سکتی ہیں تو خیال کیجیے کہ گزشتہ صدیوں میں کیا کچھ ہوا ہوگا اور کیا کچھ نہ ہوا ہوگا۔

رابعاً قدیم فارسی اور عربی کے بعض ہندسے "۶" اور "۹" اور گنتی کے الفاظ مثلاً "سبع" اور "تسع" اتنے ملتے جلتے ہیں کہ مصنف، اور مصنف سے کہیں زیادہ کاتب کی ذرا سی بھول چوک سے لفظ "سبع"، کو "تسع"، لکھنے میں کچھ دیر نہیں لگتی اور یہ معصوم سا سہو جو چھ سیکنڈ میں ہو گیا ہو، چھ صدیوں کی بحث کو جنم دے سکتا ہے۔

خامساً یہ بات یاد رکھی ضروری ہے کہ بابا صاحب، یا سلسلۂ چشت کے دوسرے صوفیائے کرام، کے بارے میں جو کتابیں ہم آپ آج کل پڑھ رہے ہیں، وہ زیادہ تر پچھلے سو، سوا سو سال کے دوران چھپے ہوئے وہ اردو تراجم ہیں جو مترجموں نے ان کتابوں کے فارسی نسخوں کی دستیاب قلمی نقول سامنے رکھ کر کیے ہیں اور یہ فارسی قلمی نقول، جنہیں ہمارے محققین اور مؤرخین "نایاب قلمی نسخے"، کہہ کر

سند اور حوالے کے قطعی ثبوت کے طور پر استعمال کرتے ہیں، درحقیقت ان اصل قلمی مسودوں کی وہ نقول، اور بسا اوقات نقول درنقول ہیں، جو آج سے کئی صدیوں قبل، لیکن کتاب کے سنِ تصنیف کے کئی صدی بعد، کئی کاتبوں کے ہاتھوں سے نکلنے کے بعد، منصۂ شہود پر آئیں۔ ان کتابوں کے اصل قلمی مسودے آج ناپید ہیں۔ اردو تراجم کی تو بات ہی چھوڑیئے، ان ''نایاب قلمی مخطوطات'' کے بارے میں بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ نقل مطابق اصل ہے بلکہ بعض جگہ تو یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ نقل کے لیے بھی عقل چاہئے۔

ان نایاب قلمی مخطوطات کے بارے میں صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ یہ نایاب ہیں، قلمی ہیں اور قدیم ہیں۔ اور آگے واللہ اعلم۔ اب دیکھتے ہیں کہ بیسویں صدی عیسوی میں شائع ہونے والی کتب میں، بابا صاحب کے سالِ وفات کے بارے میں مختلف لکھنے والوں نے، کس کے حوالے سے، کیا لکھا۔ ان لکھنے والوں میں محقق، مؤرخ، معلّم، عالم، بابا صاحب کے خانوادے سے تعلق رکھنے والے اور بابا صاحب کے عقیدت مند سبھی شامل ہیں۔

شروع میں بابا صاحب کے سالِ وفات کے بارے میں جو چار بنیادی سوالات قائم کیے گئے تھے ان کی وجہ سے اس مضمون کو کئی حصوں میں منقسم کرنا پڑا۔

پہلا حصہ اس حصے میں پہلے سوال پر بحث وتبصرہ کیا جائے گا۔

۱۔ آغاز پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم سے کرتے ہیں اور سرِ فہرست ان ہی کا نام ہونا چاہئے کیوں کہ انہوں نے، بہت محنت اور تحقیق سے، بابا صاحب کے بارے میں، غالباً ۱۹۵۳ء میں، انگریزی زبان میں، ایک فاضلانہ کتاب لکھی۔ نظامی صاحب مرحوم فریدی بھی تھے۔ تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل، اس کتاب کا نام ہے:۔

"The Life and Times of Shaikh Fariduddin Ganj-I-Shakar"

کتاب کے جس ایڈیشن کے حوالے سے بات کی جارہی ہے، وہ یونیورسل بکس، لاہور نے شائع کیا۔ سالِ اشاعت کتاب پر درج نہیں ہے۔ اس کتاب سے چار فقرے نیچے درج کیے جاتے ہیں:

(i) In Jamadi I 664 A.H/ 1265 A.D., Shaikh Nizamuddin visited his master for the last time. (صفحہ نمبر ۷۵)

(ii) On 13th Ramazan 664 A.H./ 1265 A.D, Shaikh Farid granted his

"Khilafat Namah" to Shaikh Nizamuddin Aulia. (صفحہ نمبر ۷۵)

(iii) Shaikh Farid expired in 1265 A.D. (صفحہ نمبر ۱۱۰)

صفحہ نمبر ۱۱۰ کی مزید تفصیل، صفحہ نمبر ۵۶ پر، ان الفاظ میں دی گئی ہے:

(iv) It was 5th Muharram 664 A.H. (October 15, 1265). (صفحہ نمبر ۵۶)

اس کتاب کی تصنیف کے تیس برس بعد، ۱۹۸۳ء میں، قاضی محمد حفیظ اللہ نے اس کا اردو ترجمہ کیا جو ''المعارف''، گنج بخش روڈ، لاہور نے ''احوال وآثار شیخ فریدالدین مسعود گنج شکرؒ'' کے نام سے شائع کیا۔ اس ترجمے میں، فاضل مترجم نے پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم کی انگریزی زبان کی کتاب کی بعض صریح غلطیوں اور قابلِ توضیح باتوں کی تصحیح اور وضاحت، اپنے اردو ترجمے میں، حاشیے (Foot Notes) دے کر کی۔ مذکورہ بالا چار انگریزی فقروں میں بھی، فاضل مترجم کو وضاحت کی جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوئی اسے انہوں نے اپنے اردو ترجمے میں کردی جو مندرجہ ذیل سطور میں قوسین میں درج ہے:

(۱)۔ صفحہ نمبر ۱۵۸ جمادی الاول (جمادی الاولی) ۶۶۴ھ/ ۱۲۶۵ء میں، شیخ نظام الدین اولیاء (تیسری اور) آخری بار بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے (اجودھن) گئے۔

(۲)۔ صفحہ نمبر ۱۵۹ تیرہ رمضان المبارک ۶۶۴ھ/ ۱۲۶۵ء کو بابا صاحب نے شیخ نظام الدین اولیاء کو خلافت نامہ عطا فرمایا۔

(۳)۔ صفحہ نمبر ۲۲۰ حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ ۱۲۶۵ء میں واصل بحق ہوئے۔

(۴)۔ صفحہ نمبر ۱۲۳ پانچ محرم ۶۶۴ھ کا دن تھا، پندرہ اکتوبر ۱۲۶۵ء۔

مندرجہ بالا ترجمہ سے واضح ہوتا ہے کہ پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم کی کتاب کی تصنیف کے تقریباً تیس برس بعد اس کتاب کے فاضل مترجم کو بابا صاحب کے سالِ وفات کے ۶۶۴ھ (مطابق ۱۲۶۵ء) ہونے کے بارے میں کسی قسم کا شک نہ تھا ورنہ وہ یقیناً اپنے ترجمے کے حاشیوں (Foot Notes) کی صورت میں اس کا اظہار کردیتے۔

۲۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی کا تعلق بھی بابا صاحب کے خاندان سے ہے۔ یہ تعلق صرف خاندانی نہیں بلکہ علم کے ناطے سے بھی ہے اور عقیدت کے حوالے سے بھی۔ ستمبر ۱۹۷۴ء میں، ماہنامہ ''منادی'' دہلی نے، جس کے مالک اور مدیر خواجہ حسن ثانی نظامی ہیں، ایک خصوصی نمبر ''حضرت بابا فرید نمبر'' کے نام سے نکالا۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی نے اس خصوصی نمبر میں، اپنے علم وتحقیق کی

بنیاد پر، مختلف عنوانات سے سات مضامین لکھے۔ بابا صاحب کے سالِ وفات کے بارے میں، انھوں نے ان مضامین میں جو کچھ لکھا، وہ یہ ہے:

(۱) صفحہ نمبر ۱۳ "حضرت بابا فریدؒ" کے عنوان سے، اپنے پہلے مضمون میں، پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی لکھتے ہیں:-

"حضرت بابا فریدؒ نے ۶۶۴ھ یعنی ۱۲۶۵ عیسوی میں ----- انتقال فرمایا۔"

(۲) صفحہ نمبر ۱۳

"بابا صاحب کے آخری زمانۂ عمر میں سلطان غیاث الدین بلبن حکمراں تھا۔" [واضح رہے کہ بلبن ۱۲۶۶ء میں سلطان بنا۔ اس پر تبصرہ بعد کے صفحات میں کیا گیا ہے۔]

(۳) صفحہ نمبر ۱۳۹ اپنے دوسرے مضمون میں، جو "راحت القلوب۔ ایک تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے ہے، پروفیسر نثار احمد لکھتے ہیں:-

"امیر خورد (کرمانی) دوسرے موقع پر لکھتے ہیں: سلطان المشائخ نے اپنے قلم مبارک سے لکھا ہے کہ شیخ الشیوخ حضرت بابا فریدؒ نے کاتب حروف کو بلایا، جمعہ کے دن نماز کے بعد، ۲۵ جمادی الاول (جُمادی الاولی) کو ---- اور فرمایا، تمہیں دین اور دنیا دے دی۔ یہاں تو یہی کچھ تھا۔ جاؤ ملک ہندوستان (کی ولایت) لے لو۔"

اس صفحے (صفحہ نمبر ۱۳۹) کے حاشیے نمبر ۲ میں، پروفیسر نثار احمد لکھتے ہیں:-

"یعنی یہ ۲۵ جمادی الاول (جُمادی الاولی) ۶۶۹ھ کا واقعہ ہے۔ اس تاریخ کو، حضرت محبوب الٰہی اجودھن میں حضرت بابا صاحبؒ کی خانقاہ میں مقیم تھے اور بابا صاحبؒ بقیدِ حیات تھے مگر یہاں تاریخ میں کچھ غلطی واقع ہوئی ہے کیوں کہ حضرت بابا صاحبؒ کا انتقال ۵ محرم ۶۶۴ھ کو ہوا ہے۔" "اخبار الاخیار۔ مطبع مجتبائی دہلی۔ ۱۳۳۲ھ۔ ص ۵۴)"

(۴) صفحہ نمبر ۱۴۳ "راحت القلوب۔ ایک تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے اسی مضمون میں آگے تحریر ہے:

"بابا صاحب کا انتقال ۵ محرم ۶۶۴ھ کو ہوا ہے۔۔۔ (خواجہ نظام الدین اولیاء) آخری بار رمضان ۶۶۳ھ میں اجودھن میں تھے۔ شوال (۶۶۳ھ) میں بابا صاحب نے آپ کو دہلی کے لیے رخصت کر دیا تھا اور اس کے تین ماہ بعد، محرم ۶۶۴ھ میں بابا صاحبؒ نے رحلت فرمائی۔"

اس صفحے کے حاشیے میں، پروفیسر صاحب لکھتے ہیں:-

"اسی سفر میں، تیرہ رمضان ۶۶۹ کو، بابا صاحبؒ نے (شیخ نظام الدین اولیاء کو) خلافت عطا فرمائی تھی (سیر الاولیاء: ۱۱۶)"

واضح رہے کہ پروفیسر صاحب نے یہاں بھی "سیر الاولیاء" کے مذکورہ بالا بیان پر کسی ذہنی تحفظ کا اظہار نہیں کیا ہے۔

دوسرے صفحات کو فی الحال چھوڑ کر، اگر اس وقت صفحہ نمبر ۱۶۳ اور اس کے حاشیے پر لکھی ہوئی مندرجہ بالا دونوں تحریروں کو آمنے سامنے رکھیں تو یہ عیاں ہے کہ ماہنامہ "منادی" دہلی کے ایک ہی شمارے کے ایک ہی صفحے پر، پروفیسر صاحب کے قلم سے دو متضاد باتیں نکلیں۔ پہلی یہ کہ بابا صاحب کا انتقال ۶۶۴ھ میں ہوا اور دوسری یہ کہ بابا صاحب، اس کے پانچ برس بعد، ۶۶۹ھ میں زندہ تھے اور اس سال تیرہ رمضان ۶۶۹ھ کو بابا صاحب نے خواجہ نظام الدین اولیاء کو خلافت نامہ عطا کیا۔ یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اسی ماہنامے کے اسی شمارے میں، صفحہ ۲۰۳ پر، پروفیسر صاحب نے اپنے ایک مختلف مضمون کے حاشیے میں (جس کا ذکر نیچے ہے) اس بات کا ۶۶۹ھ میں ہونا بھی غلط بتایا ہے اور اس قطعی رائے کا اظہار کیا ہے کہ یہ سال (۶۶۹ھ کی بجائے) ۶۶۰ھ ہے۔ [صفحہ نمبر ۲۰۳]

(۵) صفحہ نمبر ۱۴۵ اسی فاضلانہ مضمون میں "تاریخی غلطیاں" کے ذیلی عنوان اور "سیر الاولیاء" کا حوالہ دیتے ہوئے، پروفیسر صاحب نے لکھا ہے:-

"شیخ سعد الدین حمویہ نے ۶۵۵ھ میں انتقال کیا۔ اس کے تین سال بعد ۶۵۸ھ میں شیخ سیف الدین باخرزی کی وفات ہوئی اور ان سے تین سال بعد ۶۶۱ھ میں شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کا وصال ہوا، اور ان سے تین سال بعد حضرت شیخ فرید الدین گنج شکرؒ نے ۶۶۴ھ میں انتقال فرمایا۔" (حوالہ: سیر الاولیاء۔ ۹۱)

سنین کے بارے میں تفصیلی بحث تو اس مضمون کے بعد کے صفحات میں کی جائے گی لیکن یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ "سیر الاولیاء" کے جو فارسی اور اردو نسخے ہمارے سامنے ہیں یا "سیر الاولیاء" کے جن نسخوں کے حوالے سے پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی کے علاوہ، اور سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کے استثناء کے ساتھ دوسرے فاضل مصنفین نے سیر الاولیاء کا مندرجہ بالا بیان نقل کیا ہے، ان

نسخوں میں سنین درج نہیں، صرف چاروں صوفیائے کرام کی وفات میں تین تین سال کے وقفہ کا ذکر ہے۔ مضمون کے پہلے اور چوتھے حصّوں میں اس پر مزید تبصرہ کیا گیا ہے۔

(۶) صفحہ نمبر ۱۴۷ اسی مضمون میں وہ آگے لکھتے ہیں:

"یہ واقعہ حضرت نظام الدین کے آخری سفر اجودھن (۶۶۳ھ) کا ہوگا اور بابا صاحبؒ کے انتقال کے بعد (۶۶۴ھ میں) شمس الدین کو دبیر (اتالیق) کا عہدہ ملا ہے۔"

واضح رہے کہ صفحہ ۱۴۳ کے حاشیے میں، "سیر الاولیاء" کے حوالے سے، پروفیسر صاحب، کسی تبصرے، تحفظ یا تصحیح کے بغیر، یہ لکھ چکے ہیں کہ "اسی سفر میں تیرہ رمضان ۶۶۹ھ کو، بابا صاحبؒ نے (شیخ نظام الدین اولیاء کو) خلافت عطا فرمائی تھی۔" اور اس کے بعد، پروفیسر صاحب نے اس رائے کا بھی اظہار کیا تھا کہ یہ سال ۶۶۰ھ ہے۔ [صفحہ نمبر ۲۰۳] اور اب وہ ۶۶۳ھ کو بھی یہ سال قرار دے رہے ہیں (صفحہ نمبر ۱۴۷)۔

(۷) صفحہ نمبر ۱۸۱ "فوائد السالکین۔ ایک تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے، ماہنامہ "منادی" دہلی میں شائع ہونے والے، اپنے تیسرے مضمون میں، "سوانحی بیانات" کے ذیلی عنوان سے، پروفیسر صاحب نے، اپنے وسیع مطالعہ اور علم کی بنا پر لکھا ہے:

"ہمیں معلوم ہے کہ بابا صاحبؒ نے ۶۶۴ھ میں نوے سال سے زائد (تقریباً ۹۳ سال) کی عمر میں انتقال فرمایا ہے۔"

اس معلوم ہونے کی سند کے طور پر، پروفیسر صاحب نے اسی صفحے کے حاشیے پر، دو کتابیں یعنی "فوائد الفواد: ۸۹" اور "سیر الاولیاء: ۹۱" کے حوالے دیئے ہیں۔ "فوائد الفواد" کا حوالہ اس وجہ سے مکمل طور پر صحیح نہیں کہ "فوائد الفواد" میں، ایک مجلس کے علاوہ، کہیں کوئی سنہ تحریر نہیں، اور یہ واحد استثناء "فوائد الفواد" کی چوتھی جلد کی انتیسویں (۲۹ویں) مجلس ہے جو گیارہ جمادی الاول ۷۱۶ھ (مطابق یکم اگست ۱۳۱۶ء) اتوار کو منعقد ہوئی، جس میں خواجہ نظام الدین اولیاء نے ایک مصرعے کے حروف سے التمش کا سال وفات نکالا تھا۔

(۸) صفحہ نمبر ۱۹۵ "دُررِ نظامیہ۔ حضرت بابا فریدؒ اور حضرت محبوب الٰہی کے حالات کا ایک ماخذ" کے عنوان سے اپنے چوتھے مضمون میں پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی لکھتے ہیں:

دُررِ نظامیہ سے، حضرت نظام الدین اولیاء کے ایک سفر اجودھن کی تاریخ قطعیت سے

معلوم ہو جاتی ہے۔ آپ ۲۶ رمضان ۶۶۰ھ کو بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور اسی سال آپ کو خلافت نامہ عطا ہوا تھا۔ (دُررِ نظامیہ۔ ۱۳۶)" اسی صفحے کے حاشیے میں، پروفیسر صاحب لکھتے ہیں: "سیر الاولیاء میں بعض سنہ (سنین) صریحاً غلط ہیں۔ ان پر تفصیل سے بحث علیحدہ مضمون میں کی گئی ہے۔ اس موقع پر بھی سیر الاولیاء میں ۶۶۹ھ درج ہے حالاں کہ ۶۶۴ھ میں بابا صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔"

ہماری نظر سے پروفیسر صاحب کا وہ تحقیقی مضمون نہیں گزرا جس میں انہوں نے ۶۶۹ھ کو غلط ثابت کیا ہوگا اور "سیر الاولیاء" میں درج اسی نوع کے دوسرے "صریحاً" غلط سنین پر تفصیل سے بحث کی ہوگی، یہ مضمون یقیناً چھپ چکا ہوگا۔ تاہم یہاں غور کرنے والی بات صرف یہ ہے کہ کم از کم ستمبر ۱۹۷۴ء تک پروفیسر صاحب کی یہ مستحکم رائے تھی کہ بابا صاحب کا سال وفات ۶۶۴ھ ہے۔

"دُررِ نظامیہ" کے مصنف مولانا علی بن محمود جاندار ہیں۔ پروفیسر صاحب نے ماہنامہ "منادی" دہلی (ستمبر ۱۹۷۴ء) کے صفحہ نمبر ۱۹۰ پر لکھا ہے کہ اس کتاب کا واحد قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانے میں بتایا جاتا ہے اور اس کا فارسی متن ابھی تک (ستمبر ۱۹۷۴ء تک) غیر مطبوعہ ہے۔ صرف اردو ترجمہ دلّی سے شائع ہوا ہے جس کا سنہ اشاعت نہیں دیا گیا۔ یہ بات غور طلب ہے کہ تاریخ کے اہم امور پر قطعی رائے قائم کرنے کے لیے، اس قسم کے ترجمے پر کلّی انحصار کرنا کس حد تک مناسب اور محتاط عمل ہوگا۔

(۹) اسی صفحے پر لکھا ہے:

"بعض حضرات نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بابا صاحبؒ کے برادر خورد حضرت شیخ نجیب الدین متوکل کا انتقال بابا صاحبؒ کے وصال سے "چند ماہ" قبل ہوا تھا مگر دُررِ نظامیہ سے حضرت شیخ نجیب الدین متوکل کے انتقال کی تاریخ معلوم ہو جاتی ہے کہ انہوں نے نو رمضان ۶۶۰ھ کو سفر آخرت اختیار کیا تھا جب کہ بابا صاحبؒ پانچ محرم ۶۶۴ھ کو محبوب حقیقی سے واصل ہوئے ہیں۔"

(۱۰) اسی صفحے (صفحہ نمبر ۱۹۵) پر آگے یہ فقرہ آتا ہے:

"ہمیں معلوم ہے کہ انہوں نے (بابا صاحبؒ نے) ۶۶۴ھ میں انتقال فرمایا"

(۱۱) صفحہ نمبر ۲۰۳ (چوتھے) مضمون میں یہ لکھا گیا ہے:

(خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا کہ) ''میں نے یہ دعا یاد کر لی اور شہر میں روز پڑھتا رہا۔ پھر چھبیسویں ماہ رمضان ۶۶۰ھ میں جو حاضر خدمت ہوا تو فرمایا کہ ۔۔۔۔ تم ایسے درخت بنو گے کہ تمہارے سائے میں خلق خدا آرام کرے گی ۔۔۔۔ بعد ازاں مولانا بدرالدین اسحاق سے ارشاد کیا کہ کاغذ لا کر اجازت نامہ لکھ دو۔ انہوں نے اجازت نامہ تیار کیا۔ حضور نے اپنے دست خاص سے اجازت نامہ اور خلعت مجھے عنایت فرما کر ارشاد کیا کہ ہانسی میں مولانا جمال الدین اور دہلی میں قاضی منتخب الدین کو دکھا دینا۔''

اگر ماہنامہ منادی (ستمبر ۱۹۷۴ء) کے صفحات نمبر ۱۹۵ اور ۲۰۳ پر درج شدہ مندرجہ بالا بیانات کو درست مان لیا جائے تو اس سے دو نتائج نکلتے ہیں۔ اولاً بابا صاحب نے اپنے انتقال سے تین برس پہلے خواجہ نظام الدین اولیاء کو خلافت نامہ عطا فرمایا۔ ثانیاً جب یہ خلافت نامہ عطا کیا گیا تو مولانا جمال الدین ہانسوی زندہ تھے۔ ان دونوں نتائج کے بارے میں، بہت محتاط الفاظ میں، یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ تحقیق طلب ہیں اور ایک محقق ہونے کی حیثیت سے، پروفیسر صاحب کو بغیر تحقیق یہ درج نہ کرنے چاہئے تھے۔

(۱۲) صفحہ نمبر ۲۰۳: اسی صفحے کے حاشیے میں، پروفیسر صاحب پھر یہ لکھتے ہیں: ''سیر الاولیاء: ۱۱۶ میں خلافت ملنے کی تاریخ تیرہ رمضان ۶۶۹ھ ملتی ہے لیکن یہ غلط ہے اور دُررِ نظامیہ کی روایت یعنی ۶۶۰ھ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ تفصیلی بحث دوسرے موقع پر ہوگی۔''

یہ دوسرا موقع یقیناً آیا ہوگا جس میں پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی صاحب نے ''سیر الاولیاء'' کی روایت (۶۶۹ھ) کو غلط اور دُررِ نظامیہ کی روایت (۶۶۰ھ) کو درست ثابت کیا ہوگا۔ بابا صاحب کے صحیح سالِ وفات کا تعین کرنے والے محققین کو، اِس ''تفصیلی بحث'' کو حاصل کر کے، اس سے مکمل استفادہ کرنا چاہئے جس سے نہ صرف سالِ وفات کے صحیح تعین میں مدد ملے گی بلکہ یہ بھی معلوم ہوگا کہ بابا صاحب نے خواجہ نظام الدین اولیاء کو خلافت نامہ رمضان کی تیرہ تاریخ کو دیا تھا یا چھبیسویں تاریخ کو۔

۳۔ شیخ محمد اکرام مرحوم اُس مرحوم سروس کے رکن تھے جو انگریزی دورِ حکومت میں ''انڈین سِول سَروس'' (I.C.S) کہلاتی تھی، تاہم ان کے موت کے بعد ان کا نام زندہ ہے تو وہ ''آئی سی ایس'' افسر ہونے کی بنا پر نہیں جو ہزاروں ہوئے اور جن کا آج کوئی نام بھی نہیں جانتا، بلکہ اپنی تین معرکۃ الآرا تصانیف یعنی

''آبِ کوثر''، ''رودِ کوثر'' اور ''موجِ کوثر'' کے حوالے سے ہے۔ اپنی اوّلین تصنیف ''آبِ کوثر'' میں شیخ محمد اکرام مرحوم نے برِ صغیر پاکستان و ہند کے علماء، فقہا اور صوفیہ کی تاریخ، اس برِ صغیر میں اسلام کی آمد سے خاندانِ لودھی تک قلم بند کی ہے۔ کتاب ۱۹۳۷ء میں لکھی گئی اور ہمارے سامنے اس کا سولھواں ایڈیشن ہے جو ۱۹۹۶ء میں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ نے لاہور سے شائع کیا۔ اس کے صفحہ نمبر ۲۱۸ پر درج ہے کہ ''اپنی وفات یعنی ۱۲۶۵ء تک (بابا فرید) وہیں (یعنی پاک پٹن میں) رہے۔''

گو پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم اور شیخ محمد اکرام مرحوم، دونوں نے، بابا صاحب کا سالِ وفات ۱۲۶۵ء (مطابق ۶۶۴ھ) لکھا ہے لیکن انصاف کا تقاضا ہے کہ یہاں اس امر کا ذکر کر دیا جائے کہ جب (۱۹۳۷ء کے لگ بھگ) شیخ محمد اکرام مرحوم برِ صغیر پاک و ہند کے علماء، فقہاء اور صوفیہ کے بارے میں یہ عالمانہ کتاب لکھ رہے تھے تو ان کا مقصد اسلام کے ان عظیم سرداروں کی تاریخِ پیدائش یا تاریخِ وفات کا تعین نہ تھا۔ تاہم اگر شیخ محمد اکرام مرحوم نے اپنی عالمانہ اور محققانہ تصنیف میں جو ''آبِ کوثر'' کہلاتی ہے، بابا صاحب کا سالِ وفات ۱۲۶۵ء لکھا جو قمری تقویم کے مطابق ۶۶۴ھ بنتا ہے اور ''آبِ کوثر'' کے بعد کے ایڈیشنوں میں بھی یہی سنہ تواتر سے چھپتا رہا تو انہوں نے یہ سنہ کسی سند کی بنیاد پر لکھا ہوگا اور یہ سند وہ کتاب یا کتابیں ہوں گی جو ۱۹۳۷ء کے لگ بھگ شیخ محمد اکرام کے سامنے ہوں گی۔ شیخ محمد اکرام مرحوم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ اگر اس مستند کتاب یا ان مستند کتب میں بابا صاحب کا سالِ وفات ۱۲۶۵ء لکھا ہے تو اُسے درست تسلیم کر لینا چاہئے۔ اور پھر یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ شیخ محمد اکرام مرحوم کی تصنیف کا موضوع بابا فرید نہیں تھے بلکہ برِ صغیر پاک و ہند کے جملہ ممتاز علماء، فقہاء اور صوفیہ تھے۔ اس کے برعکس، سولہ برس بعد، ۱۹۵۳ء میں، جب پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم نے بابا صاحب کی حیاتِ طیبہ پر کتاب لکھی تو کتاب کا مبارک موضوع بابا صاحب کی ذاتِ والاصفات تھی۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم کی انگریزی زبان میں یہ کتاب، اس موضوع پر، کسی زبان میں، پہلی اور تا حال آخری، عالمانہ اور محققانہ تصنیف تھی، اور ہے۔ اس بنا پر پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم سے یہ توقع رکھنا بے جا نہ تھا کہ وہ ایک عظیم مسلم دانش گاہ اور درس گاہ کے محترم معلّم، محقق، مورّخ اور بابا صاحب کے خاندان سے نسبت رکھنے کے ناطے، بابا صاحب کے سالِ وفات کو اپنی محققانہ تصنیف میں جگہ دینے سے پہلے، ایک محقق، مورّخ اور ناقد کی نظر سے یہ جانچنے کی کوشش کرتے کہ یہ سالِ وفات

تاریخ کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔ اگر تاریخ پاک و ہند کا کوئی معلوم اور مسلمہ واقعہ یہ نشان دہی کرے کہ جس سنہ میں یہ مسلمہ واقعہ وقوع پذیر ہوا، اس سنہ میں بابا صاحب زندہ تھے یا جس قدیم ماخذ کو بنیاد بنا کر، پروفیسر صاحب نے، اپنی کتاب میں، بابا صاحب کا سال وفات ۱۲۶۵ء مطابق ۶۶۴ھ لکھا، اُسی قدیم ماخذ میں یہ بھی ذکر ہوا اور یہ ذکر پروفیسر صاحب کی نظر سے گزرا اور ان کے اپنے قلم سے تحریر ہو کہ بابا صاحب ۶۶۴ھ کے پانچ برس بعد ۶۶۹ھ میں بھی زندہ تھے، تو پروفیسر صاحب مرحوم کو، اپنی محققانہ کتاب میں، اس تضاد کی کم از کم نشان دہی ضرور کر دینی چاہئے تھی اور ۶۶۴ھ کو بابا صاحب کے سال وفات کے طور پر اپنی کتاب میں لکھنے سے اجتناب کرنا چاہئے تھا۔

ہم تو یہ کہیں گے کہ اگر بابا صاحب کے سال وفات کا صحیح تعین پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم کے ہاتھوں ہوتا، تو یہ پروفیسر صاحب کا فرض بھی بنتا تھا اور ان کا حق بھی۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم نے بابا صاحب پر، بہت محنت سے جو کتاب لکھی، اس کا کچھ اجر پروفیسر صاحب مرحوم کو اس جہاں میں ہی مل گیا، وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر اور شام میں بھارت کے سفیر ہوئے جو ہر چند کہ اعلیٰ مناصب ہیں لیکن دنیاوی، عارضی اور ادنیٰ ہیں، تاہم ان کی تصانیف، خصوصاً بابا صاحب پر ان کی کتاب آج علمی دنیا میں ایک مقام اور حوالے کی کتب کا درجہ رکھتی ہیں۔ اگر پروفیسر صاحب مرحوم بابا صاحب سے منسوب بعض دیگر (متنازعہ) روایات کے بارے میں، جس میں بابا صاحب کا سال وفات بھی شامل ہے، ایک محقق اور مؤرخ کی حیثیت سے، اپنی وقیع رائے کا اظہار کر دیتے تو یہ بابا صاحب کے چاہنے والوں پر، پروفیسر صاحب مرحوم کا احسان ہوتا۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم، پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی اور شیخ محمد اکرام مرحوم کے بعد، اب بیسویں صدی عیسوی کے اُن سوانح نگاروں پر ایک نظر ڈالتے ہیں جنھوں نے اپنی کتابوں میں بابا صاحب کا سال وفات وہی، یعنی ۶۶۴ھ لکھا ہے۔

۴۔ سید نصیر احمد جامعی کی کتاب کا نام ”حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ“ ہے جو سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور نے شائع کی۔ کتاب کا سال تصنیف اور سنہ اشاعت درج نہیں۔ صفحہ نمبر ۲۷ پر تحریر ہے:۔

”۹ محرم ۶۶۴ھ مطابق پندرہ اکتوبر ۱۲۶۵ء، بابا صاحب (نے)۔۔ جان بحق تسلیم کی۔“

مندرجہ بالا فقرے میں، لفظ ”۹“ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ مصنف یا کاتب کا سہو قلم ہے جو پروف پڑھتے وقت درست نہیں ہوا۔ بابا صاحب کی تاریخ وفات بالاتفاق پانچ محرم ہے، ۹ محرم نہیں۔ جب

کتاب میں متفقہ تاریخ وفات میں یہ سہو ہو سکتا ہے تو ظاہر ہے کہ (غیر متفقہ) سال وفات کے بارے میں لکھتے وقت کسی تحقیق سے کام نہیں لیا گیا ہوگا۔

۵۔ مولانا نور احمد خاں فریدی کا تعلق سرائیکی علاقے اور محکمہ تعلیم سے تھا، ان کی متعدد تاریخی اور تحقیقی کتابوں میں سے ایک ”مشائخ چشت“ ہے جو قصر الادب، رائٹرز کالونی، ملتان نے شائع کی۔ اس کتاب کا بھی سال تصنیف اور سنہ اشاعت درج نہیں۔ صفحہ نمبر ۱۶۷ پر لکھا ہے:۔

”۹ اکتوبر ۶۶۴ھ بمطابق پندرہ اکتوبر ۱۲۶۵ء حضرت شیخ العالم (بابا صاحب) نے جان بحق تسلیم کی۔“

پہلی بدیہی غلطی تو یہی ہے کہ ہجری سال میں اکتوبر کا مہینہ نہیں ہوتا۔ دوسری یہ کہ مولانا نور احمد خاں فریدی سے ”بھی“ ”نو“ کی تاریخ لکھنے، یا پروف پڑھنے میں سہو ہو گئی۔ سرائیکی علاقے کے ایک ممتاز معلم اور مؤرخ ہونے کے ناطے، مولانا نور احمد خاں فریدی سے یہ توقع بے جا نہ تھی کہ ان کی محققانہ کتاب میں بابا صاحب کی تاریخ وفات کے بارے میں یہ دو غلطیاں نہ پائی جاتیں بلکہ ان سے تو بجا طور پر یہ توقع رکھی جا سکتی تھی کہ اگر وہ بابا صاحب کے صحیح سال وفات کے تعین کی سعی نہیں کر سکتے تھے تو کم از کم اپنی کتاب میں بابا صاحب کے دَرج شدہ سال وفات یعنی ۶۶۴ھ، کے بارے میں اپنے تحفظات کا مختصر اظہار کر دیتے۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ یہاں بھی یہ وضاحت کر دی جائے کہ مولانا نور احمد خان فریدی کا موضوع مشائخ چشت کی تاریخ تھا، بابا صاحب کی سوانح حیات یا ان کا سال وفات نہیں۔ اس لیے اگر مولانا نور احمد خان فریدی مرحوم نے بھی، دوسرے مؤرخین اور مصنفین کی طرح، یہ قیاس کر لیا کہ بابا صاحب کا جو سال وفات، یعنی ۶۶۴ھ، بیشتر کتابوں میں لکھا ہے، وہی درست ہوگا تو یہ قیاس قابل فہم ہے۔

۶۔ سید مسلم نظامی دہلوی کا تعلق بابا صاحب کے خانوادے سے ہے۔ تقسیم ہند سے قبل، وہ دِلّی میں بستی نظام الدین میں رہتے تھے۔ جہاں بابا صاحب کے محبوب خلیفہ خواجہ نظام الدین اولیاء خوابیدہ ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد، وہ بابا صاحب کی خواب گاہ کی بستی پاک پتن میں بس گئے۔ سید مسلم نظامی دہلوی نے ”انوار الفرید المعروف بہ تاریخ فریدی“ کے نام سے ایک کتاب لکھی جو صوفیہ دار الاشاعت، بیت الفرید، اردو منزل، پاک پتن نے، ایک سے زائد بار، شائع کی۔ ہمارے سامنے جو نسخہ ہے، اس پر کتاب کا سال تصنیف اور سنہ اشاعت درج نہیں۔ صفحہ نمبر ۶۴ پر لکھا ہے:

"حضرت بابا صاحبؒ کے سن وفات ۶۶۴ھ پر سیرت نگاروں کی اکثریت ہے۔"

یہاں یہ بات نوٹ کرنے والی ہے کہ دوسرے مصنفین کے برعکس، جنہوں نے ۶۶۴ھ یا ۱۲۶۵ء کو، کسی تبصرے یا ذہنی تحفظ کے بغیر، بابا صاحب کے سال وفات کے طور پر بیان کیا ہے، سید مسلم نظامی دہلوی نے اس ایک فقرے میں اپنے تحفظات کا اظہار کردیا ہے۔

۷۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے ۱۹۵۰ء میں، "بزم صوفیہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ ہمارے سامنے اس کا دوسرا ایڈیشن ہے جو ۱۹۷۱ء میں، مطبع "معارف"، دارالمصنفین اعظم گڑھ، بھارت سے شائع ہوا۔ صفحہ نمبر ۱۷۴ پر لکھا ہے:

"گذشتہ اوراق میں ذکر آیا ہے کہ سیر الاولیاء، اخبار الاخیار، جراہر فریدی اور سفینۃ الاولیاء میں تاریخ وفات ۵ محرم روز سہ شنبہ (منگل) ۶۶۴ھ ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتی ہے۔"

یہاں یہ نوٹ کرنا ضروری ہے کہ کتاب کے صفحہ نمبر ۱۳۰ پر، مصنف نے شیخ بہاء الدین زکریا کا سال وفات، "سیر الاولیاء" کے صفحہ نمبر ۹۱ کے حوالے سے، "۶۶۷ھ" لکھا ہے یعنی بابا صاحب کے وصال سے تین برس بعد۔

۸۔ شیخ مجدد الف ثانیؒ اور ابوالفضل کے ہم عصر شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی مشہور کتاب "اخبار الاخیار" کا نقشِ اوّل، آج سے کوئی چار صدی پہلے مرتب کیا، گویا یہ بات گیارہویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی کے ابتدائی دَور کی ہے۔ "مرآۃ الاسرار" کے مصنف شیخ عبدالرحمٰن چشتی (جن کا ذکر آگے آئے گا۔) کا تعلق بھی اِسی صدی سے ہے اور اِسی طرح وہ اِن متذکرہ بالا تین اصحاب کے ہم عصر خورد ہیں۔ مندرجہ ذیل جدوَل سے یہ بات مزید واضح ہوجائے گی:

نمبر شمار	نام	پیدائش		وفات		عمر
		ہجری سال	عیسوی سال	ہجری سال	عیسوی سال	عیسوی تقویم سے
۱۔	شیخ عبدالحق محدث دہلوی	۹۵۸ھ	۱۵۵۱ء	۱۰۵۲ھ	۱۶۴۲ء	۹۱ برس
۲۔	ابوالفضل	۹۵۸ھ	۱۵۵۱ء	۱۰۱۱ھ	۱۶۰۲ء	۵۱ برس
۳۔	شیخ مجدد الف ثانی	۹۷۱ھ	۱۵۶۳ء	۱۰۳۴ھ	۱۶۲۴ء	۶۱ برس
۴۔	شیخ عبدالرحمٰن چشتی	۱۰۰۵ھ	۱۵۹۶ء	۱۰۹۴ھ	۱۶۸۲ء	۸۶ برس

ہمارے سامنے "اخبار الاخیار" کے جو دو اردو تراجم ہیں، ان دونوں میں بابا صاحب کا سال وفات مختلف درج ہے۔ تفصیلات یہ ہیں:

(۱)۔ "اخبار الاخیار" کے اردو ترجمے کا نام: "انوار صوفیہ" مترجم: محمد لطیف ملک سال اشاعت: پہلا ایڈیشن: ۱۹۵۸ء
ناشر: شعاع ادب: لاہور دوسرا ": ۱۹۶۲ء

دوسرے ایڈیشن کے صفحہ نمبر ۱۱۱ پر تحریر ہے:

"حضرت بابا فرید گنج شکر پانچویں محرم ۶۶۴ھ میں اس جہانِ فانی سے رحلت فرما گئے۔
مر ریف ۹۵ سال کی تھی۔"

(۲)۔ اردو ترجمے کا نام: "اخبار الاخیار" مترجم: اقبال الدین احمد سال اشاعت: ۱۹۹۷ء
ناشر: دارالاشاعت: اردو بازار، کراچی

صفحہ نمبر ۸۶ پر تحریر ہے:

"بابا فرید گنج شکرؒ نے اپنی عمر کے (۵۹) سال پورے کرکے ۵ محرم ۶۶۸ھ میں وفات پائی۔"

ہمارا پہلا تبصرہ یہ ہے کہ ترجمہ نمبر (۲) میں، "۵۹" کا عدد قوسین میں لکھنے کی کوئی وجہ بظاہر نظر نہیں آتی۔ کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ کسی نے، جمع تفریق کرنے کے بعد، یہ عدد بعد میں لکھ دیا ہو۔ ترجمہ (۱) میں "۹۵" کا عدد جو بابا صاحب کی عمر بتاتا ہے، قوسین سے باہر ہے، یہی ترجمہ نمبر (۲) میں بھی ہونا چاہئے تھا۔ ثانیاً ترجمہ نمبر (۲) میں "۵۹" کا عدد صریحاً غلط ہے۔ "فوائد الفواد" کے مطابق بابا صاحب کی عمر ۹۳ (قمری برس) اور "سیر الاولیاء" کے مطابق ۹۵ (قمری برس) تھی۔ اس امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا کہ ترجمہ نمبر (۲) کے مترجم یا کاتب نے "۹۵" کو الٹ کر "۵۹" لکھ دیا ہو لیکن تب بھی "۵۹" کو قوسین میں لکھنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، لیکن تیسری اور سمجھ میں نہ آنے والی سب سے بڑی غلطی، ترجمہ نمبر (۲) کے صفحہ نمبر ۸۴ پر یہ ناقابلِ فہم اندراج ہے:

(بابا صاحب کی) "پیدائش: ۹۰۶" (اس عدد کے آگے ہجری کا نشان ہے نہ عیسوی سنہ کا)

"وفات: ۶۶۸ھ"

ایسا لگتا ہے کہ کسی ستم ظریف نے (جو کاتب نہیں ہوسکتا) ترجمہ نمبر (۲) میں درج شدہ سنہ وفات یعنی "۶۶۸" سے "۵۹" منہا کرنے کے بعد "۶۰۹" کا جو عدد حاصل ہوا، وہ بھی، "۵۹" کے عدد کی طرح، الٹ کر یہاں "۹۰۶" لکھ دیا۔ بابا صاحب کا سال وفات جن ناقابلِ یقین اغلاط کا شکار رہا

ہے، یہ اس کی ایک شاہکار مثال ہے۔ غلطیاں اپنی جگہ، لیکن یہ بات تحقیق طلب ہے کہ ترجمہ نمبر (۲) میں "۶۶۸" ھ کا جو اندراج بابا صاحب کے سالِ وفات کے طور پر کیا گیا ہے، وہ مصنف نے اپنے کسی قلمی نسخے میں کیا ہے یا یہاں بھی مترجم، یا کاتب، سے سہو ہوگئی ہے۔ جیسا کہ اس مضمون کے تیسرے حصے میں آگے چل کر بتایا گیا ہے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے معاصر ابوالفضل اور ان کے معاصر خورد شیخ عبدالرحمٰن چشتی نے اپنی تصانیف میں، جو بالترتیب "آئینِ اکبری" اور "مرآۃ الاسرار" کہلاتی ہیں، ۶۶۸ھ (مطابق ۱۲۶۹ء) کو ہی بابا صاحب کے سنہ وفات کے طور پر لکھا ہے۔ تاہم "اخبار الاخیار" کے مطبوعہ فارسی متن کے علاوہ اردو کے مندرجہ ذیل چار فاضل مصنفین نے، "اخبار الاخیار" کے حوالے سے ہی، بابا صاحب کا سالِ وفات ۶۶۴ھ (مطابق ۱۲۶۵ء) لکھا ہے:

نمبر شمار	کتاب/رسالہ	مصنف	صفحہ	سنہ اشاعت
۱۔	بزم صوفیہ	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	۱۷۴	پہلا ایڈیشن: ۱۹۵۰ء دوسرا: ۱۹۷۱ء
۲۔	تذکرہ حضرت باب فرید گنج شکر	طالب ہاشمی	۱۷۴	نہیں دیا۔
۳۔	سوانح حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر	وحید احمد مسعود فریدی	۱۸۲ (حاشیہ)	پہلا ایڈیشن: ۱۹۶۵ء دوسرا: ۱۹۹۶ء
۴۔	ماہنامہ منادی دہلی	نثار احمد فاروقی فریدی	۳۹ (حاشیہ)	ستمبر ۱۹۶۶ء

۹۔ مغل بادشاہ شاہ جہاں کے سب سے بڑے بیٹے دارا شکوہ نے "سفینۃ الاولیاء" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس کے مترجم محمد علی لطفی اور ناشر نفیس اکیڈمی، اسٹریچن روڈ، کراچی ہیں۔ ہمارے سامنے اس کا پانچواں ایڈیشن ہے جس کا سنہ اشاعت (جولائی) ۱۹۷۵ء ہے۔ دارا شکوہ ۱۶۵۸ء میں، ۴۳ برس کی عمر میں، قتل کر دیا گیا۔ اس طرح یہ کتاب بھی سترھویں صدی عیسوی سے تعلق رکھتی ہے۔ ترجمے کے صفحہ نمبر ۱۳۳ پر تحریر ہے:

"آپ (بابا صاحب) کی وفات سہ شنبہ (منگل) ۵ محرم ۶۶۴ھ کو ہوئی"

۱۰۔ مولانا علی اصغر چشتی کی کتاب کا نام "جواہر فریدی" ہے اور سنہ تصنیف ۱۰۳۳ھ (مطابق ۲۴-۱۶۲۳ء) یعنی یہ بھی سترھویں صدی عیسوی (کے پہلے نصف حصے) سے تعلق رکھتی ہے۔ بیسویں صدی عیسوی کے مندرجہ ذیل دو سیرت نگاروں کے مطابق، "جواہر فریدی" میں بابا صاحب کا سنہ وفات ۶۶۴ھ مرقوم ہے۔ ان دونوں کتابوں کی جملہ تفصیلات، اس مضمون کے تیسرے حصے میں درج

ہیں۔ ان کتابوں سے متعلقہ اقتباسات یہ ہیں:۔

(۱) "سوانح عمری حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ" مصنف: وحید احمد مسعود فریدی

پہلے ایڈیشن (۱۹۶۵ء) اور دوسرے ایڈیشن (۱۹۹۶ء) دونوں کے صفحات نمبر ۱۸۲۔۱۸۱ کے حاشیے میں لکھا ہے:

"سالِ وفات کے بارے میں مختلف تذکرے مختلف البیان ہیں۔ ملاحظہ ہو:

جواہر فریدی: ۶۶۴ھ

(باقی)

٭٭٭

گجرات میں علم حدیث اور شیخ عبدالمالک بنمیانی ★

از ضیاء الدین اصلاحی

گجرات کی سرزمین کو ہندوستان کے دوسرے علاقوں پر کئی حیثیتوں سے شرف و مزیت حاصل ہے، سب سے پہلے مسلمانوں کے قدم اسی پر پڑے اور یہاں کے بام و در اذانِ توحید سے گونجے، گجرات کی یہ بھی خوش نصیبی ہے کہ علم حدیث کی اشاعت پہلے یہیں ہوئی۔ نئی تاریخ کی روشنی میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (التوفی ۱۰۵۲ھ/ ۱۶۴۲ء) کے متعلق یہ مقولہ صحیح نہیں ثابت ہوتا کہ "اول کسے کہ تخمِ حدیث در ہند کشت او بود" کیونکہ اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ علم حدیث پہلے گجرات میں شائع و ذائع ہوا اور شیخ عبدالحق اس کے بعد پیدا ہوئے اس لئے ان کی نسبت سے مقولہ کا اطلاق صرف شمالی ہندوستان پر درست ہوگا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں علم حدیث کے فروغ کا اصل زمانہ نویں صدی ہجری کے آخر یا دسویں صدی کے آغاز سے شروع ہوتا ہے جب مصر، شام اور حجاز میں امام حدیث حافظ محمد عبدالرحمٰن سخاوی التوفی ۹۰۲ھ/ ۱۴۹۶ء کے فضل و کمال کا آفتاب نصف النہار پر تھا اور ان کے فیض و افادہ کی کرنیں دنیائے اسلام کے ہر گوشے میں پڑ رہی تھیں مولانا سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں:۔

"ہندوستان کے مختلف صوبوں میں سب سے پہلے گجرات نے اپنا طبعی حق پایا یعنی بحرِ عرب کے اس پار کی شعاعیں سب سے پہلے یہیں آکر پڑیں اور یہاں سے وہ آگرہ کی مسجدوں اور مدرسوں کے مناروں پر جاکر عکس انداز ہوئیں۔

حافظ سخاوی کے تلامذہ میں سب سے پہلے غالباً مولانا راجح بن داؤد گجراتی ہیں، ۸۹۴ھ/ ۱۴۸۹ء میں وہ حافظ موصوف کے حلقہ میں داخل ہوئے اور الفیہ حدیث کی سند حاصل کی، اس

★ یہ مقالہ درگاہ پیر محمد شریف احمد آباد کے سمینار منعقدہ ۱۴ تا ۱۶/ اکتوبر کو پڑھا گیا۔

کے بعد وہ گجرات وارد ہوئے، لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا، ۹۰۴ھ (۱۴۹۸۔۱۴۹۹ء) میں احمد آباد میں وفات پائی، اس کے بعد مولانا وجیہ الدین محمد مالکی آئے، ان کی بڑی قدر ہوئی، سلطانِ گجرات نے ان کو ملک المحدثین کا خطاب دیا وہ یہیں کے ہو رہے، ۹۲۹ھ (۱۵۲۳ء) میں وفات پائی، ان ہی کے ہم عصر مولانا علاء الدین احمد نہروالی ہیں۔ عرب جاکر حافظ ابن فہد اور نورالدین شیرازی سے حدیث کی سند حاصل کی، آخر عمر مکہ معظمہ میں گزار دی اور وہیں اپنا سلسلۂ درس جاری رکھا، ۹۴۹ء (۱۵۴۲ء) میں وفات پائی۔

ان ہی کے قریب العہد حافظ سخاوی کے دوسرے شاگرد جمال الدین محمد بن عمر حضرمی مظفر شاہ حلیم سلطان گجرات کے زمانے میں آئے، سلطان نے خود زانوئے ادب انکے سامنے تہہ کیا اور اپنا استاد بنایا، احمد آباد میں ۹۳۱ھ (۱۵۲۴ء۔۱۵۲۵ء) میں وفات پائی"۔(۱)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شیخ عبدالحق دہلویؒ کی پیدائش سے پہلے ہی گجرات میں شیخ الاسلام زکریا، حافظ شمس الدین سخاوی اور علامہ ابن حجر مکی کے تلامذہ کی درس گاہیں کھل گئی تھیں اور تشنگان حدیث ان سے سیراب ہو رہے تھے۔

مولانا سید سلیمان ندوی (التوفی ۱۳۷۳ھ/ ۱۹۵۳ء) کا بیان ہے کہ عرب اور ہندوستان کو ایک کرنے کی سعادت سلاطین گجرات کی قسمت میں آئی، مسلمان پہلی صدی سے لے کر آٹھویں صدی ہجری کے وسط تک کئی ناکام حملے کر چکے تھے، آخر علاء الدین خلجی نے ان تمام ناکامیوں کو اپنی کامیابی سے بدل دیا، محمد شاہ تغلق کے عہد میں گجرات کا گورنر ظفر خاں ہوا، اس نے مرکز کی کمزوری دیکھ کر فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں گجرات کی مستقل حکومت قائم کرکے مظفر شاہ کا خطاب اختیار کیا، اس کی وفات ۸۱۳ھ (۱۴۱۰ء) کے بعد اس کے فرزند سعید احمد شاہ نے زمامِ حکومت سنبھالی اس کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:۔

یہی وہ خوش نصیب سلطان ہے، جس نے گجرات کو عرب اور ہندوستان کے بیچ میں سلسلۃ الذہب بنا دیا اور اس طرح بحرِ عرب کے دونوں کنارے مل گئے اور بحری راستے کی آمد و رفت نے سالوں کا راستہ مہینوں میں طے کر دیا اور انتظام اور پابندی کے ساتھ جہازات آنے جانے لگے، حاجیوں کے قافلے سال بہ سال سلاطین بیجاپور و گجرات کی نگرانی میں سمندر کے راستے سے جانے لگے اور اسی راستے سے علم کے مشتاق عرب کے رخ کرنے لگے اور اس طرح علم حدیث

(۱) مقالات سلیمان حصہ دوم ص ۱۱ معارف پریس اعظم گڈھ ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۸ء

کا تخم عرب سے ہندوستان کو منتقل ہونے لگا اور ہندوستان کے مختلف شہروں میں زمین اور آب و ہوا کی موافقت سے برگ و بار پیدا کرنا شروع کیا''(۱)

علم نوازی اور ادب پروری میں سلاطین گجرات کے امتیاز و تفوق کا حال مولانا حکیم عبدالحیٔ سابق ناظم ندوۃ العلما کی زبان قلم سے سنئے :-

''میرا خیال تو یہ ہے اور میں اس کو بلاخوف مخالفت کہہ سکتا ہوں کہ شاہان گجرات نے اپنی ڈیڑھ دوسو برس کے زمانہ فرماں روائی میں جس قدر علوم و فنون کی سرپرستی کی ہے، دہلی کی شش صد سالہ تاریخ اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی، یہ صرف ان کی قدر دانی اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ تھا کہ شیراز و یمن و دیگر ممالک اسلامیہ کے چیدہ و برگزیدہ علما نے گجرات میں آکر بود و باش اختیار فرمائی جن کے فیوض سے چند دنوں میں گجرات مالا مال ہوگیا اور خود گجرات میں اس پایہ کے علما پیدا ہوئے جن کے فیوض علمی کی آب یاری سے اب تک ہندوستان کی درس گاہیں سیراب ہو رہی ہیں''۔(۲)

گجرات کے بعض شہروں اور خاندانوں نے حدیث شریف کی جو خدمات اور کارنامے انجام دئے ہیں وہ لازوال اور جریدۂ عالم پر ثبت ہو گئے ہیں، زین البلاد احمد آباد کو بھی اس میں بڑی عزت اور فضیلت حاصل ہے، یہ سلاطین گجرات کا پایہ تخت تھا، یہاں کے علماء و فضلا کی بدولت علم حدیث کی بڑی نشر و اشاعت ہوئی اور اس کا فیض نہایت عام ہوا، یہاں کے جو خاندان اس میدان میں گوئے سبقت لے گئے ہیں ان میں بنمیانی خاندان کو امتیازی درجہ حاصل ہے، اس میں متعدد علماء و اصحاب کمال پیدا ہوئے جن کے کارناموں سے اب تک گنبد مینا پر شور ہے، بنمیانی علما نے مسند درس کو بھی زینت بخشی اور ارشاد و ہدایت کا چراغ بھی روشن کیا، قضا و افتا کے منصب پر بھی فائز ہوئے، حکومت کا نظم و نسق سنبھالنے اور امور مملکت سر انجام دینے والے وزرا و اعیان دولت بھی اس خاندان میں گزرے جنھوں نے علوم و فنون کی سرپرستی کی، ادب و ثقافت کی آب یاری کی، اہل علم و فن کی قدر دانی کی، صوفیہ و مشائخ کے دامن سے وابستہ رہے اور بعض نے خود اپنے ذاتی فضل و کمال اور علم و ادب میں امتیاز کے نقوش بھی یادگار چھوڑے۔

ڈاکٹر سید باقر علی ترمذی سابق استاذ شعبہ عربی اسماعیل کالج بمبئی نے ''جمعات شاہیہ'' جلد چہارم کے قلمی نسخہ کے حوالے سے بنمیانی کی اصل یہ بتائی ہے۔

(۱) مقالات سلیمان حصہ دوم ص ۹ (۲) یاد ایام ص ۲۸ شبلی بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۲۶ء

''بنمیان ولایتے است مابین خراسان و ملتان و ایں جماعت کہ بہ ملک گجرات بہ بنمیانیان مشہور اند از آں جا آمدہ اند و ایشاں از حضرت عبداللہ بن عباس اند''(۱)

یعنی خراسان و ملتان کے درمیان بنمیان ایک جگہ کا نام ہے اور یہ جماعت جو صوبہ گجرات میں بنمیانیان کے نام سے مشہور ہے وہیں سے یہاں آئی ہے اور اس کا نسلی تعلق حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے۔

اس خاندان کے شیخ صدرالدین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ سب سے پہلے گجرات تشریف لائے تھے اور کئی کتابیں تصنیف کر کے شاہان گجرات کے نام معنون کی تھیں، ان کی خاص دلچسپی عربی ادب اور صرف و نحو سے تھی۔ نحو کی مشہور کتاب الوافی کی شرح الکافی ان ہی کی لکھی ہوئی ہے جس کو ہندوستان میں الکافی کی پہلی شرح سمجھا جاتا ہے، شیخ صدرالدین نے قصیدہ بردہ، قصیدہ کعب بن زہیر اور قاضی عبدالمقتدر کے قصیدہ لامیہ کے حواشی اور فن تفسیر میں ایک کتاب بحرالمعانی بھی لکھی تھی، وہ آٹھویں صدی کے آخر یا نویں صدی کے ابتدائی زمانے میں بقید حیات تھے۔ غالباً شیخ منہاج الدین بنمیانی ان ہی کے فرزند تھے جن کو علم حدیث، تصوف اور صرف و نحو سے زیادہ اشتغال تھا، چند نحوی مسائل کے بارے میں ایک مصری عالم شیخ بدرالدین دمامینی سے احمد آباد میں ان کا مباحثہ ہوا تو مصری عالم نے ان کے رد میں الفتح الربانی فی الرد علی البنمیانی لکھی، شیخ منہاج کثیر التصانیف تھے، لیکن شروح حدیث میں صرف صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی شرحوں کے نام ملتے ہیں۔

شیخ فیض اللہ بن زین العابدین بنمیانی، سلطان محمود بیگڑو (۸۶۳-۹۱۷ھ/۱۴۵۹-۱۵۱۱ء) کے خزانچی تھے، جس کے نام سے اپنی فن تفسیر کی کتاب دستور الحفاظ معنون کی تھی، شیخ کی تاریخ صدر جہاں اور مجمع النوادر بھی مشہور اور مفید کتابیں تھیں۔(۲)

شیخ عبدالمالک بنمیانی محدث بھی اسی خاندان کے ایک مایہ ناز اور ممتاز شخص تھے، گو اس خانوادے کے دوسرے بزرگوں کی طرح ان کے حالات بھی باد حوادث کی نذر ہو گئے تاہم ان کے متعلق جو باتیں معلوم ہو سکی ہیں وہ یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

نام و نسب اور خاندان نام عبدالمالک اور والد کا نام شیخ محمود تھا، ان کا خاندان بنمیان سے احمد آباد آیا تھا جس کے بارے میں اوپر بتایا جا چکا ہے کہ وہ خراسان و ملتان کے درمیان واقع تھا، یہ

(۱) معارف اعظم گڈھ جلد ۶۶ عدد ۴ (اکتوبر ۵۰ء) ص ۲۸۲ (۲) ایضاً ص ۲۸۲ و ۲۸۳

خاندان علمی حیثیت سے ممتاز تھا، اس کے جن افراد کا ذکر ملتا ہے ان میں سے بعض کا تذکرہ پہلے آیا تھا، یہ سب دینی علوم تفسیر، حدیث، فقہ وتصوف اور علوم آلیہ ادب وعربیت اور نحو وصرف میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے اوران میں تصانیف بھی یادگار چھوڑی تھیں، بعض اہل خاندان کو فن تاریخ سے بھی شغف تھا۔

بنمیان کی نسبت سے شیخ عبدالمالک بنمیانی کہلائے اور چونکہ ان کا نسبی تعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے تھا اس لئے عباسی کی نسبت سے بھی مشہور ہوئے، ڈاکٹر سید باقر علی ترمذی نے ان کے شجرۂ نسب کی چند کڑیاں اس طرح تحریر فرمائی ہیں:

شیخ عبدالمالک بن شیخ محمود بن شیخ خضر بن شیخ نصیرالدین بن شیخ برہان الدین بن شیخ خضر بن شیخ عیسٰی بن شیخ حسن بن شیخ الیاس۔(۱)

ولادت شیخ عبدالمالک کی ولادت کا سنہ معلوم نہیں ہوسکا، قیاس وقرینہ سے کہا جاسکتا ہے کہ نویں صدی کے اختتام یا دسویں صدی کے آغاز میں ان کی پیدائش ہوئی ہوگی۔

مولد مولانا حکیم سید عبدالحئیؒ نے شیخ عبدالمالک کو احمد آبادی لکھا ہے (۲) اور ڈاکٹر سید باقر علی ترمذی لکھتے ہیں "شیخ عبدالمالک زین البلاد احمد آباد میں پیدا ہوئے" (۳)۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کو گجرات کے باشندے لکھا ہے (۴)۔ اس میں اور اول الذکر دونوں بیان میں کوئی تضاد نہیں، شیخ کا مولد ووطن احمد آباد ہی تھا۔

اساتذہ شیخ نے کئی بزرگوں سے تحصیل فن کی ہوگی مگر افسوس کہ ان سب کے نام معلوم نہیں ہوسکے، صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنے بڑے بھائی شیخ قطب الدین (۵) سے حدیث شریف پڑھی تھی اور بھائی نے علامہ شیخ شمس الدین محمد بن سخاوی مصری صاحب الضوٴ اللامع سے حدیث کا درس

(۱) حوالہ گزشتہ ص ۲۸۳ (۲) نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۱۸، مطبوعہ حیدرآباد (۳) ماہنامہ معارف جلد ۶۶ عدد ۴، اکتوبر ۱۹۵۰ء ص ۲۸۳ (۴) مقالات سلیمان حصہ دوم ص ۱۳ (۵) شیخ قطب الدین بنمیانی کے حالات سے طبقات وتراجم کی کتابیں خالی ہیں، نزہۃ الخواطر (جلد ۴ ص ۲۷۱) میں مولانا عبدالحئیؒ صاحب نے جن شیخ قطب الدین گجراتی کا ذکر کیا ہے وہ یہ نہیں ہیں بلکہ نہروالہ کے باشندے اور ذاکر وصوفی اور قطبِ جہاں تھے، مگر اپنی دوسری کتاب الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند ص ۱۳۶ و ۱۳۷ طبع دمشق میں جن قطب الدین عباسی گجراتی کا نام لیا ہے وہ یہی ہیں، ان کا شمار ان علمائے ہند میں کیا ہے جو گجرات سے حرمین شریفین تشریف لے گئے اور وہاں سے علم حدیث کی تحصیل کرکے ہندوستان واپس آئے اور خلق خدا کو فیض یاب کیا۔

لیا تھا، اس طرح شیخ عبدالمالک صرف ایک واسطہ سے حافظ سخاوی کے شاگرد تھے۔

ڈاکٹر سید باقر علی ترمذی نے اپنے مضمون میں شیخ عبدالمالک کی صحاح ستہ اور موطاء امام مالک کی اسناد نقل کی ہیں جو شیخ رشیدالدین چشتی کی کتاب مخبرالاولیا سے ماخوذ ہیں جس کا ایک نسخہ انھوں نے ایشیاٹک سوسائٹی ممبئی کے کتب خانہ میں موجود بتایا ہے، تمام کتابوں کے سلسلۂ اسناد میں پہلا نام محمد المدعو بجاراللہ درج ہے، ان کے اوپر کی سند کے نام ہر کتاب میں مختلف ہیں اس طرح انہوں نے اپنے بھائی قطب الدین کے علاوہ محمد جاراللہ سے بھی حدیث کا درس لیا تھا ڈاکٹر صاحب کی تحریر کردہ اسناد سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد جاراللہ کے والد کا نام عزالدین عبدالعزیز تھا (۱) لیکن مولانا حبیب الرحمان الاعظمی نے محمد جاراللہ کے والد کا نام صرف عبدالعزیز لکھا ہے اور سنہ وفات ۹۵۴ھ/ ۱۵۴۷ء بتایا ہے (۲)۔

تلامذہ شیخ عبدالمالک جس پایہ کے محدث تھے، اس کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ ان سے فیض یاب ہونے والے بے شمار لوگ رہے ہوں گے مگر ان کے صرف ایک ہی شاگرد کمال (یا کمال الدین) محمد عباسی کا نام ملتا ہے، جن کو بعض لوگوں نے شیخ عبدالمالک کا پوتا بھی کہا ہے، ڈاکٹر سید باقر لکھتے ہیں:

"حدیث میں مولانا عبدالمالک کے ممتاز شاگردوں میں مولانا کمال محمد عباسی (مفتی اجین، مالوہ) کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے"۔ (۳)

مولانا کمال محمد عباسی مفتی اجین کے متعلق مولانا عبدالحئیؒ صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اسے ہم یہاں بعینہٖ نقل کرتے ہیں، اس سے اندازہ ہوگا کہ ان کی زندگی کتنی مرتب اور منضبط تھی۔

"شیخ کمال محمد عباسی گجراتی ایک بڑے عالم اور مفتی تھے جو فقہ، اصول اور عربیت کے ممتاز اور ماہر علما میں تھے، احمد آباد میں ان کی پیدائش ہوئی اور یہیں نشوونما پائی، بچپن ہی سے علامہ وجیہ الدین بن نصراللہ گجراتی کی درس گاہ میں حصول علم میں مشغول ہوگئے اور زمانہ دراز تک ان کی خدمت میں رہ کر کسب کمال کرتے رہے اور اپنے ہم عصروں سے گوئے سبقت لے گئے، علامہ وجیہ الدین ہی سے طریقت وسلوک کی تعلیم حاصل کی اور حدیث کی سند شیخ عبدالملک بنمیانی سے لی۔

اس کے بعد وہ احمد آباد سے ۹۸۰ھ/ ۱۵۷۲ء میں اجین چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کرلی اور شیخ اولیاء بن سراج کالپوی کی صاحب زادی سے عقد کیا اور افتا کے منصب پر فائز

(۱) معارف اکتوبر ۱۹۵۰ء صفحات ۲۸۵ تا ۲۸۸ (۲) معارف جلد ۷۳ عدد ۱ جنوری ۱۹۵۴ء ص ۶۴
(۳) معارف اکتوبر ۱۹۵۰ء ص ۲۸۴

ہوئے اور تیس (۳۰) برس تک تدریس و افتا کی خدمت میں مشغول رہے''۔(۱)

مولانا عبدالحئی صاحب نے گلزار ابرار کے حوالے سے شیخ کمال محمد عباسی کے یہ معمولات نقل کئے ہیں:۔

''جب ایک تہائی رات باقی رہتی تو وہ بیدار ہو جاتے، غسل فرماتے اور تہجد کی نماز پڑھتے جس میں سات جز قرآن مجید کی قرأت کرتے، پھر ماثورہ دعائیں پڑھتے، اس کے بعد بزرگان شطاریہ کے طریقے کے مطابق ذکر جلی فرماتے پھر نماز فجر ادا کرتے، اس کے بعد اشراق کی نماز کے وقت تک تلاوت قرآن میں مشغول رہتے، پھر اشراق کی نماز پڑھتے، اس کے بعد درس و افادہ کا سلسلہ شروع کرتے جو زوال کے وقت تک جاری رہتا، اس کے بعد کھانا تناول فرماتے جس میں طلبہ کی جماعت بھی شریک رہتی تھی۔ پھر ایک گھنٹہ تک قیلولہ کرتے، اس کے بعد ظہر کی نماز ادا کرتے، پھر مجلس افتا کو رونق بخشتے اور عصر کی نماز تک اس میں مشغول رہتے، عصر بعد پھر اسی کام میں مشغول ہو جاتے اور جب مغرب کا وقت ہوتا تو نماز پڑھ کر اپنے رفقا و تلامذہ کی جانب متوجہ ہوتے اور عشا تک ان سے بات چیت فرماتے، عشا بعد اپنے کمرے میں داخل ہوتے اور ایک تہائی رات تک ان کتابوں کا مطالعہ کرتے جن کا درس دینا ہوتا تھا پھر خواب گاہ میں تشریف لے جاتے،

۱۵ برس کی عمر سے ۵۴ برس کی عمر تک ان کی زندگی اسی انداز پر گزری۔ یکشنبہ ۱۰/ شعبان ۱۰۱۳ھ/۱۶۰۶ء کو انتقال ہوا''۔(۲)

حفظ و ذہانت ذہانت و جودتِ طبع میں یکتائے روزگار تھے، مولانا حکیم سید عبدالحئی سابق ناظم ندوۃ العلما لکھنؤ کا بیان ہے وکان عبدالملک مفرط الذکاء و جیدالقریحة (۳)۔ عبدالمالک غیر معمولی ذہین اور طباع تھے حافظہ غضب کا تھا، قرآن مجید کی طرح صحیح بخاری اور بعض دوسری کتب حدیث کے حافظ تھے۔

حدیث میں کمال و امتیاز مولانا عبدالمالک کی خاص شہرت اسی فن میں کمال و امتیاز کی بنا پر ہے، ان کے حالات زندگی تو ناپید ہیں مگر ایک مشہور گجراتی محدث کی حیثیت سے اب تک ان کا نام لوحِ جہاں میں محفوظ ہے، ڈاکٹر سید باقر علی ترمذی فرماتے ہیں ''حدیث میں بڑا کمال حاصل کیا اور

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۱۶ و ۳۱۷ (۲) ایضاً ص ۳۱۷ (۳) ایضاً جلد ۴ ص ۲۱۸

استاد زمانہ کے رتبہ عالی پر فائز ہوئے'' حدیث کے درس و تدریس میں اپنی عمر گزاری، انہیں قرآن مجید کی طرح صحیح بخاری پوری زبانی یاد تھی اور اس کے معانی و مطالب کے بھی پورے حافظ تھے، زبانی بخاری شریف کا درس دیتے تھے، مولانا عبدالحئی صاحب نے لکھا ہے:

وکان حافظا للقرآن الحکیم و صحیح البخاری لفظاً و معنیً وکان یدرس عن ظهر قلبه (۱)

وہ قرآن مجید اور صحیح بخاری کے الفاظ و معانی کے حافظ تھے اور زبانی ہی درس دیتے تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید اور صحیح بخاری کے علاوہ دوسرے علوم اور درسیات کی کتابیں بھی زبانی یاد تھیں، ڈاکٹر سید باقر علی ترمذی لکھتے ہیں

''صحیح بخاری از بر تھی، تمام علوم کا درس زبانی دیا کرتے تھے''۔(۲)

مولانا عبدالمالک کی کسی تصنیف کا علم نہیں ہو سکا لیکن مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب کے ایک بیان سے خیال ہوتا ہے کہ درس و تدریس سے لوگوں کو مستفید اور فیض یاب کرنے کے علاوہ ان کو تصنیف و تالیف سے بھی اشتغال رہا ہوگا وہ فرماتے ہیں:

''مولانا عبدالمالک عباسی کا شمار ان محدثین کرام میں ہے جنھوں نے ساری عمر اسی فن شریف کی خدمت میں صرف کی''۔(۳)

لیکن اگر قرطاس و قلم کا مشغلہ نہ بھی رہا ہو تو کیا یہ کم ہے کہ وہ درس حدیث میں بڑے ممتاز اور فائق تھے، اور ان کے درس و تدریس کی وجہ سے احادیث کی بڑی نشر و اشاعت ہوئی۔

دوسرے علوم سے شغف حدیث میں جس طرح استاد زمانہ اور عالی رتبہ تھے، تفسیر میں بھی کمال حاصل تھا اور فقہ و عربیت میں بھی یکتا تھے، مولانا سید عبدالحئی رائے بریلوی لکھتے ہیں ''له مشارکة جیدة فی الفقه والحدیث والتفسیر والعربیة'' (۴)

تصوف و سلوک گجرات خصوصاً احمد آباد ہر زمانے میں صوفیہ و مشائخ کا گہوارہ رہا ہے، یہاں تصوف کے کئی سلسلے رائج و مقبول ہوئے، سہروردیہ سلسلہ کی زیادہ اشاعت ہوئی، حضرت سید برہان الدین مشہور بہ قطب عالم (متوفی ۸۵۷ھ/ ۱۴۵۳ء) نبیرۂ مخدوم جہانیاں سید جلال بخاری (متوفی ۷۸۵ھ/ ۱۳۸۴ء) وہ معروف سہروردی عارف ہیں جو سب سے پہلے اپنے وطن سے گجرات تشریف

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۱۸ (۲) معارف اکتوبر ۱۹۵۰ء ص ۲۸۴ (۳) یاد ایام یعنی تاریخ گجرات ص ۵۵ (۴) نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۱۸

لائے اور یہیں کے ہو رہے، ان کی اور ان کے اہل خاندان اور خلفا کی مساعی جمیلہ سے گجرات سہروردی سلسلۂ تصوف کا ایک عظیم مرکز ہو گیا، شیخ عبدالمالک کا خانوادہ بھی اسی سلسلہ سے منسلک تھا، اور خود ان کا تعلق بھی سہروردی سلسلے ہی سے تھا ڈاکٹر سید باقر علی ترمذی لکھتے ہیں:

'' خاندان کے اور بزرگوں کی طرح شیخ عبدالمالک بھی خانوادۂ سہروردیہ سے منسلک تھے، غالباً ان ہی کی خانقاہ میں تعلیم پائی ہوگی''۔(۱)

شیخ عبدالمالک توکل و تجرید میں بے مثال تھے، اوراد و اذکار میں برابر مشغول رہتے تھے، مولانا سید عبدالحی رقم طراز ہیں:

ولم یکن مثله فی زمانه فی التوکل و التجرید(۲) — اپنے زمانے میں توکل و تجرید میں بے نظیر تھے،

وفات شیخ عبدالمالک کی وفات کا سنہ متعین طور پر معلوم نہیں ہو سکا، لیکن کہا جاتا ہے کہ ۹۷۰ھ/ ۱۵۶۲ء کے قریب وفات ہوئی، اسی لحاظ سے ہم نے ان کا سنہ ولادت دسویں ہجری کا آغاز یا نویں صدی کا آخر قرار دیا تھا۔

اولاد و احفاد مولانا عبدالمالک کے ایک فرزند شیخ عبداللطیف کا ذکر قاضی سید نورالدین حسین صاحب نے کیا ہے، اور ان ہی سے متاثر ہو کر ڈاکٹر سید باقر علی ترمذی نے بھی شیخ عبداللطیف کو ان کا بیٹا قرار دیا ہے اور مزید یہ بھی تحریر کیا ہے کہ انھوں نے علامہ صغانی کی مشارق الانوار کی شرح مبارق الازہار لکھی تھی جس کا ایک مخطوطہ بھروچ کے قاضی نورالدین صاحب کے ذاتی کتب خانہ میں موجود تھا، ان حضرات کے بیان کے مطابق شیخ عبداللطیف احمد آباد کے باشندے تھے اور ان کے والد کا نام عبدالمالک بنمیانی تھا، عبداللطیف کی وفات ۹۱۵ھ/ ۱۵۰۹۔ ۱۵۱۰ء میں ہوئی، ان کے صاحب زادے یعنی عبدالمالک کے پوتے بھی عالم تھے اور ان کا نام شیخ خلیل محمد عباسی تھا۔ انہوں نے اپنے والد سے علم حدیث حاصل کیا، احمد آباد کے بخاریوں کے ایک مشہور عالم اور صوفی سید مقبول عالم ان ہی سے روایت کرتے ہیں چنانچہ علامہ نورالدین (متوفی ۱۱۵۵ھ/ ۱۷۴۲ء) نورالقاری فی شرح البخاری میں فرماتے ہیں:

وبه قال مولانا مقبول عالم حدثنی مولانا خلیل محمد العباسی البنمیانی حدثنی والدی عبداللطیف حدثنی والدی عبدالملک حدثنی محمد المدعو بجار الله عن والده(۱)

اور یہی مولانا مقبول عالم نے فرمایا کہ مجھ سے مولانا خلیل محمد عباسی نے حدیث بیان کی، انھوں نے کہا مجھ سے میرے والد عبداللطیف نے حدیث بیان کی اور انہوں نے کہا مجھ سے میرے والد عبدالمالک نے حدیث بیان کی، انہوں نے فرمایا کہ مجھ سے محمد جاراللہ نے اپنے والد کے حوالے سے حدیث روایت کی۔

(۱) معارف اکتوبر ۵۰ء ص ۲۸۳ (۲) نزھۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۱۸

لیکن قاضی نورالدین اور ڈاکٹر سید باقر علی کا مبارق الازہار کو شیخ عبداللطیف بن عبدالمالک کی تصنیف قرار دینا صحیح نہیں ہے، مبارق الازہار کے مصنف عزالدین عبداللطیف بن عبدالعزیز المعروف بابن الملک تھے (۲)، ان کی یہ شرح استنبول سے ۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء میں چھپ گئی ہے اور وہ احمد آباد کے باشندے نہیں تھے بلکہ رومی عالم تھے، ان کی تصنیفات میں شرح مجمع البحرین فقہ میں اور شرح منار اصول فقہ میں بھی بہت مستند اور علما میں متداول رہی ہیں، اس کے متعلق ماضی قریب کے مشہور ہندوستانی فاضل و نامور محدث مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی (متوفی ۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۲ء) کا ایک محققانہ مضمون معارف میں شائع ہوا ہے، جس میں ناقابل تردید دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ مبارق الازہار عبدالملک بن عبدالعزیز بن امین المعروف بابن فرشتہ یا عبداللطیف بن الملک کی تصنیف ہے، مولانا نے تحقیق سے سنہ وفات ۹۱۵ھ/ ۱۵۰۹ء کو بھی غلط قرار دیا ہے اور استنبول کے نسخہ میں درج سنہ وفات ۷۹۷ھ/ ۱۳۹۵ء کو بھی صحیح تسلیم نہیں کیا ہے بلکہ علامہ ابن العماد حنبلی (متوفی ۱۰۸۹ھ/ ۱۶۷۸ء) کے بیان پر اعتماد کر کے لکھا ہے کہ ابن فرشتہ کی وفات تقریباً ۸۸۵ھ/ ۱۴۸۰ء میں ہوئی، مولانا کے نزدیک مصنف کا ہندوستانی ہونا محقق نہیں، انہوں نے علامہ محمد بن علی شوکانی (المتوفی ۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۴ء) کی البدر الطالع کے حوالے سے لکھا ہے کہ مصنف ایک رومی عالم تھے جو سلطان مراد کے زمانے میں موجود تھے (۳)

ڈاکٹر سید باقر علی مرحوم نے شیخ عبداللطیف کا سنہ وفات ۹۱۵ھ لکھا ہے جو بداہتاً غلط ہے

(۱) معارف اکتوبر ۱۹۵۰ء ص ۲۸۴ (۲) مطبوعہ نسخہ کے ٹائٹل پر شارح کا نام اسی طرح لکھا ہے مگر دیباچہ میں خود شارح نے اس طرح لکھا ہے وبعد فیقول العبد الضعیف العزیز عبداللطیف بن عبدالعزیز المعروف بابن الملک (مبارق الازہار ج ۱ ص ۲) اور الضوء اللامع میں عبداللطیف بن عبدالعزیز بن امین الدین بن فرشتہ دیا ہے (ج ۴ ص ۳۲۹) اور یہی علامہ شوکانی نے بھی لکھا ہے (البدر الطالع ج ۱ ص ۳۷۴) اور ابن عماد نے المولی عزالدین عبداللطیف بن الملک الحنفی الشہیر بابن فرشتہ دیا ہے (ج ۷ ص ۳۴۲) یہ بھی واضح رہے کہ فرشتہ اور ملک ہم معنی ہیں (۳) معارف جنوری ۱۹۵۴ء مضمون بہ عنوان مبارق الازہار کس کی تصنیف ہے؟)

کیونکہ شیخ عبداللطیف کے والد شیخ عبدالمالک کا سنہ وفات انہوں نے خود ۹۷۰ھ کے قریب بتایا ہے، اس لحاظ سے ان کے کسی صاحب علم و مصنف بیٹے کا ان سے ۵۵ برس پہلے وفات پانا مستبعد ہے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے شیخ عبدالمالک کا نام شیخ عبدالعزیز المعروف بہ عبدالملک لکھا ہے، یہ بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا، غالباً مبارق الازہار کے قلمی نسخے پر دئے ہوئے نام کی وجہ سے یہ غلطی ہوئی ہوگی۔

محدث عبدالمالک کے جن پوتے مولانا خلیل محمد عباسی کا نام ڈاکٹر سید باقر علی ترمذی نے لکھا ہے، ان کے حالات بھی اس عاجز کو تذکروں میں نہیں ملے۔

علامہ جامی کی ایک نو دریافت مثنوی

"سیف الملوک و بدیع الجمال"

از جناب طارق جملی ★

(۲)

جامی کے اس شعری مجموعے کا وزن مفاعیلن مفاعیلن فعولن یا مفاعیلن اور بحر مسدس محذوف یا مقصور ہے۔ اور یہی وزن اور بحر ان کی پانچویں "مثنوی یوسف زلیخا" کا ہے۔ یعنی یہ "ہفت اورنگ" کی پانچویں مثنوی ہے۔ حضرت جامی نے مولانا نظامی گنجوی کی مثنوی "خسرو شیریں" کے وزن پر اسکو نظم کیا ہے اس کا سال تصنیف ۸۸۸ھ ہے اور یہ ابوالغازی سلطان حسین بایقرا نامی پر معنون ہے۔ (۱) اُردو دائرۂ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار لکھتے ہیں:۔

"یوسف زلیخا ۸۸۸ھ/ ۱۴۸۳ء جامی کی مشہور مثنوی ہے یہ متصوفانہ انداز میں حضرت یوسف بن حضرت یعقوب علیہ السلام کے افسانوی حالات زندگی کا بیان ہے۔ اس کا جرمن ترجمہ از ROSENWEG ۱۸۲۴ء، فرانسیسی ترجمہ از ABRICTEUX ۱۸۸۲ء اور انگریزی ترجمہ از R.T.H. GRIFFITH ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا"۔ (۲)

جامی نے "مثنوی سیف الملوک" میں وہی انداز و زبان اختیار کی ہے۔ جو کہ اپنی شہرہ آفاق "مثنوی یوسف زلیخا" میں استعمال کی ہے۔ دونوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو ان میں بڑی حد تک یکسانیت نظر آئے گی۔ زبان کی یکسانیت کی نظر آئے گی۔ زبان کی یکسانیت کی چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔

★ 8 DAL BY AVE بریڈفورڈ، انگلستان

مثنوی سیف الملوک	مثنوی یوسف زلیخا
بحالِ زارِمن اے شاہ انجم	زمہجوری برآمد جانِ عالم
ترحّم کن ترحّم کن ترحّم (۳)	ترحّم یا نبی اللہ ترحّم (۴)
سخن در راویٔ شیریں فسانہ	سخن پرداز کن ایں شیریں فسانہ
چنیں زلفِ سخن راکرد شانہ (۵)	چنیں آرد فسانہ درمیانہ (۶)
چو شب گیسو فساں شد برزخ روز	فغاں زیں چرخ دلابی کہ ہرروز
ہمہ پیوست ناھید دل افروز (۷)	بجا ہے افگند ما ہے دل افروز (۸)
زجامی نامہ باشد اہتمامی	بحُسنِ اہتمامت کارِ جامیؔ
کہ از دعواتِ آثرامی بخوابی (۹)	طفیل دیگراں یا بدتمامی (۱۰)

قصہ سیف الملوک فارسی ادب میں

سیف الملوک سلطان محمود غزنوی م ۴۲۱ھ/ ۱۰۲۹ء نے شمس الکفاۃ ابوالقاسم احمد بن حسن میمندی م محرم ۴۲۴ھ/ ۱۰۳۲ء کے ذریعہ دمشق سے زبدۃ الجواب نامی قصوں کی کتاب منگوا کر عربی سے فارسی میں منتقل کرائی۔ اس طرح سیف الملوک کا قصہ عربی سے پانچویں صدی ہجری میں فارسی زبان میں ترجمہ ہوا۔ پھر اس سے دیگر مشرقی زبانوں میں یہ قصہ ترجمہ ہو کر متعارف ہوا۔ فارسی زبان میں جن مصنفین نے اس قصہ کو اپنی کتابوں میں درج کیا ہے ان کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ سیف الملوک یا الملوک، مؤلف، جسونت رائے ۱۲۰۰ھ/ ۱۷۸۶ء نے ۱۱۳۵ھ/ ۱۷۲۳ء میں اس قصہ کو تحریر کیا۔ (۱۱)

۲۔ انڈیا آفس لائبریری کی توضیحی فہرست کے مطابق ایک دوسرا فارسی کا مخطوطہ بھی سیف الملک کا ہے جس کا مصنف اور سنِ تالیف نامعلوم ہے۔ (۱۲)

۳۔ یورک شائر کے مشہور شہر لیڈیز برطانیہ کی پبلک لائبریری میں ایک کتاب افسانہ ہائے آذربائیجان آذافشار مطبوعہ تہران مطبوعہ ۱۳۶۹ھ/ ۱۹۴۹ء کے صفحہ ۱۴۹ تا ۱۶۷ پر سیف الملوک کے نام پر یہ داستان فارسی نثر میں ہے۔ مگر اس کا سنِ تالیف اور مصنف نامعلوم ہے۔

۴۔ سندھ میں تالپور دور ۱۱۸۷ھ/ ۱۷۸۳ء تا ۱۲۵۹ھ/ ۱۸۴۳ء کا شاعر میر نصیر اللہ خاں کا چچا صوبیدار خاں بھی فارسی کا قادرالکلام شاعر تھا۔ اس کا تخلص میرؔ تھا اُس نے مثنوی سیف الملوک ۱۲۴۷ھ/ ۱۸۳۱ء میں بہ زبانِ فارسی لکھی۔ (۱۳)

۵۔ میر ابوالمکارم شہود م ۱۰۷۳ھ/ ۶۳-۱۶۶۲ء قصہ سیف الملوک و بدیع الجمال مکمل کر رہا تھا کہ سہون شریف کے مقام پر اس کا انتقال ہو گیا۔ (۱۴)

سیف الملوک کے غیر ملکی تراجم کے مصنف کی تحقیق کے مطابق فارسی زبان میں مندرجہ ذیل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ جن میں داستان سیف الملوک کو بیان کیا گیا ہے۔

الف۔ گلشنِ عشق، مصنف، مرزا بدیع

ب۔ سیر السلوک، مصنف، مُلا محمد عثمان جلال آبادی

ت۔ جذب رسا، مصنف، دیوان سنگھ لاہوری، سنِ تالیف ۱۲۴۷ھ/ ۱۸۷۵ء

ث۔ فارسی نثر میں داستان سیف الملوک ۱۱۹ ابواب پر مشتمل چترال کے شہزادے کی فرمائش پر مرزا محمد غفران نے ۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء میں تالیف کی۔

محققین کے نزدیک یہ قصہ الف لیلہ ولیلۃ سے اخذ کیا گیا ہے۔ جو بحیثیت داستان اس کا حصہ تھا۔ اَب ہزار داستان کے تراجم مختلف زبانوں میں ہوئے اور مشرقی و مغربی زبانوں کے ازمنۂ وسطیٰ کے ادب میں موجود ہیں۔

دائرہ معارف اسلامیہ کے فاضل مقالہ نگار نے یورپی زبانوں بالخصوص فرنچ، جرمن، انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں میں الف لیلہ ولیلۃ کے تراجم کس صدی میں اور کس سال جن مآخذات کے تحت ہوئے پُر از معلومات بحث کی۔ مقالہ نگار کے نزدیک اٹھارہویں صدی عیسوی بمطابق بارہویں صدی ہجری میں اس داستان کے ترجمے ہوئے نیز فاضل مقالہ نگار کے نزدیک اس میں کچھ اور داستانیں بالخصوص سیف الملوک ایرانی الاصل اور کچھ ہندی الاصل ہیں۔ (۱۵)

میرے سامنے "قصہ سیف الملوک" کا جو خطی نسخہ تھا اور جس کا عکس بھی مدیر معارف کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ اس میں مصنف نے اپنے تخلص جامیؔ کے استعمال ہی پر اکتفا کیا ہے۔ اور اپنا مکمل نام نہیں دیا۔ میں نے جامی کے تخلص کی بنیاد پر اس کتاب کو مولانا عبدالرحمٰن جامیؔ رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب کیا ہے۔ قصہ سیف الملوک اور یوسف زلیخا مصنفہ مولانا جامی کا تقابلی جائزہ اور دونوں

میں یکسانیت دکھا کر میں نے اپنے خیال کو مزید تقویت دینے کی کوشش کی ہے۔ دُنیا کے مختلف کتب خانوں کی فہرستوں کی طرف رجوع کرنے کے باوجود جامی سے منسوب اس نام کی کسی تصنیف کا سُراغ مجھے نہیں مل سکا ہے (۱۶)۔ اس اعتبار سے پیش نظر نسخہ قصہ سیف الملوک دنیا کا واحد نسخہ معلوم ہوتا ہے۔ اسکا تعارف راقم نے محققین کے سامنے اس لئے پیش کیا ہے کہ شاید کسی محقق کو اس قصہ سیف الملوک کے بارے میں مزید معلومات مل جائیں تو اس سے یہ گتھی سلجھانے میں مدد ملے گو میں اپنی اس دریافت کو حرفِ آخر نہیں سمجھتا تاہم میں نے مولانا جامیؔ کی تصنیف قصہ سیف الملوک اور مخطوطہ کا مفصل مطالعہ و تجزیہ کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ یہ مولانا عبدالرحمٰن جامیؔ کی تصنیف ہے۔ اور اس کے ثبوت کے لئے ان کے کلام کو شہادت میں پیش کیا ہے۔

میں نے ایڈنبرا یونیورسٹی کے فارسی مخطوطات کی فہرست (۱۷) بوڈلین لائبریری فارسی مخطوطات کی توضیحی فہرست اور برٹش لائبریری کی فارسی مخطوطات کی مشروح فہرستیں منگوائیں تو ان کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ جامیؔ تخلص کے حسب ذیل اشخاص بھی تھے۔ جن کی تصانیف مذکورہ کتبخانوں میں ہیں۔ ۱۔ ابو ناصر محمد بن ابوالحسن جامیؔ ۲۔ محمد جامیؔ ۳۔ محمد قلی جامیؔ ۴۔ نورالدین عبدالرحمٰن جامیؔ (۱۸) ۵۔ معین الدین جامیؔ ۶۔ عبدالنبی جامیؔ (۱۹) مگر مجھے مذکورہ بالا فہرستوں میں "قصہ سیف الملوک"، کسی دوسرے جامیؔ سے منسوب نہیں مل سکا ع

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

ماخذ و حواشی

(۱) جامی عبدالرحمٰن، مولانا، نفحات الانس، مترجم شمس بریلوی، ص ۵۰، مطبوعہ کراچی جون ۱۹۸۲ء

(۲) اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، جلد ۷ ص ۶۰، مطبوعہ، دانشگاہ پنجاب لاہور ۱۹۷۱ء طبع اوّل

خانلری، زہرا، ڈاکٹر، فرہنگ ادبیات فارسی، ص ۱۵۴، مطبوعہ، ایران، ۱۳۶۶ھ

(۳) جامی عبدالرحمٰن، مولانا، قصہ سیف الملوک، قلمی، ص ۱۳۵

(۴) جامی عبدالرحمٰن، مولانا، یوسف زلیخا، ص ۱۵، مطبوعہ، ملک سراج الدین اینڈ سنز لاہور

(۵) جامی عبدالرحمٰن، مولانا، قصہ سیف الملوک، خطی، ص ۱۴

(۶) جامی عبدالرحمٰن، مولانا، یوسف زلیخا، ص ۱۰۵، مطبوعہ، ملک سراج الدین اینڈ سنز لاہور

(۷) جامی عبدالرحمٰن، مولانا، قصہ سیف الملوک قلمی، ص ۴۴

(۸) جامی عبدالرحمٰن، مولانا، یوسف زلیخا ص ۸۲، مطبوعہ، ملک سراج الدین اینڈ سنز لاہور

(۹) جامی عبدالرحمٰن، مولانا، قصہ سیف الملوک، قلمی، ص ۱۷۲

(۱۰) جامی عبدالرحمٰن، مولانا، یوسف زلیخا ص ۱۷۱، مطبوعہ، ملک سراج الدین اینڈ سنز لاہور

(۱۱) محمد بخش میاں، قصہ سیف الملوک منظوم پنجابی، مطبوعہ، محکمہ اوقاف مظفر آباد آزاد کشمیر

(۱۲) جامی عبدالرحمٰن، مولانا، قصہ سیف الملوک نثر، فارسی، ص ۱ قلمی

(۱۳) اےتھے، فارسی مخطوطات کی مشروح فہرست، جلد اوّل ص ۲۵۱، مطبوعہ، انڈیا آفس لائبریری لنڈن

(۱۴) ایضاً ص ۲۵۱

(۱۵) تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان، علاقائی ادب مغربی پاکستان جلد اوّل ص ۵۳۹، مطبوعہ، دانشگاہ پنجاب لاہور۔

(۱۶) تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان، فارسی ادب، جلد دوم، ص ۷۴۳، مطبوعہ، دانشگاہ پنجاب لاہور۔

(۱۷) اشرف، ایم، پروفیسر، قصہ سیف الملوک کے غیر ملکی تراجم، تاریخ اشاعت ۱۹۷۹ء، بحوالہ ماہ نو جلد اوّل ص ۵۸۰، مطبوعہ لاہور۔

(۱۸) اُردو دائرۂ معارف اسلامیہ، جلد ۱ تا جلد ۲۴، مطبوعہ دانشگاہ پنجاب لاہور

نوشاہی، عارف سیّد، فہرست کتابہائے فارسی سنگی و کمیاب، کتابخانہ گنج بخش، اوّل، دوم، مطبوعہ، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اسلام آباد ۱۹۸۹ء

اےتھے، توضیحی فہرست فارسی مخطوطات انڈیا آفس لائبریری، مطبوعہ، آکسفورڈ پریس لنڈن ۱۹۸۰ء

عربی، فارسی، اُردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست، اوّل تا سوم، کتابخانہ حضرت پیر محمد شاہ درگاہ شریف ٹرسٹ احمد آباد انڈیا ۱۹۹۲ء

زور، محی الدین، ڈاکٹر، تذکرہ مخطوطات اوّل تا پنجم، مطبوعہ، ترقی اُردو بیورو نئی دہلی ۱۹۸۴ء

کاظمی، عباس حسین، فہرست کتب عربی، فارسی، اُردو، کتب خانہ آصفیہ، سرکار عالی، حیدر آباد دکن انڈیا

اشرف محمد، فارسی مخطوطات در سالار جنگ میوزیم و کتب خانہ، مطبوعہ، دائرہ معارف العثمانیہ حیدر آباد، جلد دوم ۱۹۶۶ء

جرنل، خدا بخش پٹنہ، ۶۹-۷۶، مطبوعہ اورنٹیل پبلک لائبریری پٹنہ انڈیا ۱۹۹۲ء

حسین، محمد بشیر، ڈاکٹر، فہرست مخطوطات شیرانی، اوّل تا سوم، مطبوعہ، ادارہ تحقیقات پاکستان دانشگاہ، پنجاب لاہور ۱۹۶۹ء

منزوی، احمد، فہرست مشترک نسخہ ہائے خطی فارسی، مطبوعہ مرکز تحقیقات فارسی وایران اسلام آباد۔ اسکی بیشتر فہرستیں میرے پیش نظر رہیں

براؤن، ایڈورڈ، جی، کیمبرج یونیورسٹی کے کتابخانہ کے فارسی مخطوطات کی فہرست، مطبوعہ، کیمبرج یونیورسٹی ۱۸۹۶ء

حسین، محمد بشیر، ڈاکٹر، فہرست مخطوطات شفیع، فارسی اُردو، پنجابی، مطبوعہ، انتشارات دانش گاہ پنجاب لاہور دسمبر ۱۹۷۲ء/شوال ۱۳۹۲ھ

آربری، اے، جے، کتاب خانہ انڈیا آفس میں فارسی کی مطبوعہ کتابیں، مطبوعہ، آکسفورڈ پریس لندن، ۱۹۳۷ء

عبدالحق، مولوی، ڈاکٹر، قاموس الکتب جلد اوّل تا سوم، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی ۱۹۶۱ء کے علاوہ خدابخش لائبریری کی عربی وفارسی مخطوطات کی توضیحی فہرست جو کہ ۳۶ جلدوں میں شائع ہوئی۔ پیش نظر رہیں۔

(۱۹) اشرف الحق، محمد، ایم۔اے۔ اور ایتھے، ہرمان، ایڈنبرا یونیورسٹی لائبریری میں عربی وفارسی مخطوطات ص ۲۶۱، مطبوعہ، ہرٹ فورڈ، انگلینڈ ۱۹۲۵ء

بیسٹن، اے۔ ایف۔ ایل۔ بوڈلین لائبریری میں فارسی، ترکش، ہندستانی، اور پشتو مخطوطات کی فہرست، جلد سوم، ص ۱۳۶، مطبوعہ، آکسفورڈ ۱۹۵۴ء

ولی عیسیٰ، محمد، سپلیمنٹری ہینڈلسٹ آف پرشین مینوسکرپٹ ۱۹۶۸ء۔۱۹۶۶ء مطبوعہ، برٹش لائبریری لندن ۱۹۹۸ء صفحہ ۹۶

یک دُرِّ ناقبول از گنجینۂ اقبال

از جناب ماسٹر سید اختر حسین صاحب ★

ستمبر ۲۰۰۱ء کے معارف میں جناب اکبر رحمانی صاحب کا مضمون پڑھ کر کوئی حیرت نہ ہوئی۔ حیرت تو تب ہوتی جب وہ اپنا دیرینہ روّیہ چھوڑ کر اصل معاملات کی وضاحت فرماتے۔ لہذا ہمیشہ کی طرح موصوف کی ساری بات اس ناچیز کی تعریف وتوصیف سے شروع ہوکر تعریف وتوصیف پر ہی ختم ہوگئی اور وہ اس جوش میں یہ بھی بھول گئے کہ "معارف" اپریل ۲۰۰۱ء میں راقم کی معروضات الگ سے کوئی مضمون نہیں تھا بلکہ جنوری ۲۰۰۱ء کے "معارف" میں اُن کے ایک بے سروپا دعوے کا جواب تھا۔ اُن کی ساری بات صرف ایک جملے میں ختم ہوسکتی تھی کہ وہ اُن ثبوتوں کو جو اُن کے معترضین کا منہ بند کردیں کب شائع فرمارہے ہیں؟ اپنے معترضین کو بُرا بھلا کہہ کر اپنے دِل کی بھڑاس نکال لینا مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ اسلئے ضروری نہیں تھا کہ ایک بے مقصد اور لاحاصل بحث پر اپنا وقت اور "معارف" کے قیمتی صفحات کے ضیاع کا سبب بنوں لیکن چونکہ موصوف نے دس بارہ سال پُرانے معاملات کو شاید یہ سوچ کر چھیڑا ہے کہ اقبالیات میں دلچسپی رکھنے والوں کے اذہان سے سچائیاں محو ہو چکی ہوں گی نیز اقبالیات کے واردانِ نو اُن کے ارشادات کو من عن قبول فرمالیں گے اس لئے راقم بھی کچھ عرض کرنے پر مجبور ہوا۔

۱۔ لمعہ کی بحث برسوں پہلے ختم ہوچکی ہے یہ راقم ہی نہیں کہتا زمانہ کہتا ہے۔

۲۔ راقم کا موقف ردِّ لمعہ ہے نہ کہ طرفداریٔ لمعہ پھر رحمانی صاحب کیوں متواتر یہ الزام دئے جارہے ہیں کہ راقم نے اپنے موقف کے ثبوت میں لمعہ کا کوئی خط دریافت نہیں کیا۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ

★ نزد کربلا، منصب منزل، بھوپال

کوئی طالب علم اپنے ممتحن کے سوال پر اُلٹا یہ سوال ڈال دے کہ کیا اُسے بھی اس سوال کا جواب معلوم ہے۔

۳۔ شکر ہے کہ جناب اکبر رحمانی صاحب نے خود ہی یہ قبول کر لیا کہ اُنہوں نے دس سال پہلے "کتاب نما" میں یہ اعلان فرمایا تھا کہ اُن کی تحویل میں لمعہ کے نام علاّمہ اقبال کے ساٹھ سے زائد خطوط ہیں۔ لیکن حیرت ہے کہ اُنہیں یہ کیوں یاد نہیں رہا کہ اُسی "کتاب نما" کی دوسری اشاعت میں راقم نے اُن سے گذارش کی تھی کہ اُن خطوط کی دستیابی کے صرف اعلان پر ہی اکتفا نہ کیجیے سب نہیں تو صرف چھ عدد خطوط ہی شائع فرما کر اپنی خوشی میں سب کو شامل کر لیجیے۔ ساتھ ہی اُن سے یہ گذارش بھی کی تھی کہ اجازت ہو تو راقم جناب افتخار امام صاحب کی معیت میں اُن کے در دولت پر حاضر ہو کر اُن خطوط کی صداقت کی تصدیق بھی کرا لے لیکن رحمانی صاحب نے جواب میں ایسی چپ سادھ لی کہ وہ دن ہے اور آج کا دن متعدد یاد دہانیوں کا بھی اُن پر کچھ اثر نہ ہوا۔ قارئین کرام کو یاد ہوگا کہ اپریل ۲۰۰۱ء کے معارف میں بھی راقم نے یہی بات دہرائی تھی۔ اس لئے ابھی تک تو لوگوں کا یہ کہنا ہی حرف بحرف صحیح ثابت ہوتا چلا آرہا ہے کہ "اقبال کے کرم فرما" کی اشاعت کے بعد رحمانی صاحب نے اپنی شرمندگی مٹانے اور اقبالیات میں بنے رہنے کے لئے یہ شوشہ چھوڑا ہے۔ اس درمیان اُن کے خطوط کے دیدار کی کئی بار اُمید بندھی۔ ایک بار جب وہ پاکستان تشریف لے گئے اور "بزم اقبال" لاہور کو اُن خطوط کی اشاعت پر رضامند کر لیا۔ لیکن جب "بزم اقبال" کے صدر جناب ڈاکٹر عبداللہ قریشی نے راقم کو اِن خطوط کی اشاعت کے فیصلے سے آگاہ کیا تو راقم نے اپنا وضع کردہ شہرت یافتہ خط "غالب بنام اقبالؔ" اُن کی خدمت میں ارسال کر کے اُنہیں کسی خط کے صرف عکس پر ہی بھروسہ کر لینے کے خطرات سے آگاہ کیا اور بات شاید اُن کی سمجھ میں آگئی۔

اُس کے بعد اکبر رحمانی صاحب نے پونا یونیورسٹی کا رُخ کیا۔ وہاں لمعہ پر اُن کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے رجسٹریشن کے بعد یہ اُمید پھر بندھی کہ ہم اقبالیات کے پیاسوں کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ لیکن افسوس کہ وہاں بھی ہماری امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ اب کہیں جا کر 'معارف' ستمبر ۲۰۰۱ء کو یہ فخر حاصل ہوا ہے کہ اُنہوں نے کوئی کتاب شائع کرانے اور تمام خطوط کو منظرِ عام پر لانے کا اعلان فرمایا۔ لیکن پچھلے تجربات کے پیشِ نظر اس احتمال سے کہ کہیں

پروفیسر صاحب کا یہ اعلان بھی محض تسلی نہ ثابت ہو راقم اُن سے یہ گذارش کرتا ہے کہ وہ صرف ایک عدد ہی ایسا بے داغ و صاف سُتھرا خط جو حضرت لمعہ کی کارگذاریوں سے بچ گیا ہو اُن کی ہی پسند کے کم از کم دو ماہرین اقبالیات سے اُس کی صداقت کی تصدیق کرا کر شائع فرما دیں تاکہ دنیائے اقبالیات کی اُن کی کتاب کے انتظار کی گھڑیاں سکون بخش و خوشگوار ہو جائیں۔

۴۔ جناب عبدالقوی دسنوی صاحب کے سلسلے میں جناب پروفیسر اکبر رحمانی صاحب کے راقم پر عائد کردہ الزامات پر قارئین کی دلچسپی و معلومات کے لئے اب چند تفصیلی وضاحتیں لازمی ہو گئی ہیں۔ رحمانی صاحب کے یہ ارشاد فرمانے پر کہ راقم قوی صاحب کا کوئی حق غصب کرنا چاہتا ہے یا لمعہ کی بحث میں اُن پر سبقت حاصل کرنا چاہتا ہے یہ عرض ہے کہ رحمانی صاحب نے یہ فرض کر لیا ہے یا شاید خواب دیکھ لیا ہے کہ عبدالقوی دسنوی صاحب نے اس موضوع پر کوئی مقالہ تحریر فرمایا ہے یا کوئی کتاب لکھی ہے۔ ہاں۔ بجز ایک مختصر سی تحریر کے جو راقم کی کتاب "اقبال کے کرم فرما" کی اشاعت سے ٹھیک ستائیس دن پہلے بعنوان "اقبال اور لمعہ حیدرآبادی" ۸؍اپریل ۱۹۸۹ء کے "ہماری زبان" میں شائع ہوئی اور جس کی مشمولات کے نکاتِ نارسا "اقبال کے کرمفرما" میں شامل ہو کر اعتراض برائے اعتراض کی مثال بن گئے۔

اکبر رحمانی صاحب کے یہ فرمانے پر کہ لمعہ پر بحث کا دروازہ عبدالقوی دسنوی صاحب نے کھولا اُن کی لاعلمی اور خود سے ہی بے خبری پر افسوس بھی ہوا اور ہنسی بھی آئی۔ دراصل آج سے اٹھاون سال پہلے ڈاکٹر تاثیر اُس کے بعد نظر حیدرآبادی، عبدالواحد معینی، جناب پروفیسر اکبر رحمانی (ماہنامہ "قومی آواز" کراچی۔ جنوری ۱۹۷۸ء) اور ماسٹر اختر اگست ۱۹۸۷ء جس کا گواہ راقم کے نام خود رحمانی صاحب کا ۹؍اکتوبر ۱۹۸۷ء کا خط ہے۔ اور اس سچائی سے شاید جناب عبدالقوی دسنوی صاحب بھی اختلاف نہ کریں کہ راقم اُن کی تحریر کی اشاعت سے کوئی ڈیڑھ سال پہلے سے اس موضوع پر کام کر رہا تھا۔ ہر چند کہ ان سے اس موضوع پر کبھی تبادلۂ خیال نہیں ہوا۔ لیکن ہمارے درمیان بہترین تعلقات ہونے کی بنا پر راقم اُنہیں اپنی کتاب کے متعلق وقتاً فوقتاً آگاہ کرتا رہا تھا۔ راقم اُس وقت حیران رہ گیا جب قوی صاحب کی تحریر غیر متوقع طور پر سامنے آ پڑی جو نہ تو سامانِ ردِ لمعہ ثابت ہو سکتی تھی نہ ہی وجہ تائید لمعہ۔ اُنہوں نے دو ایسے خطوط کو اپنے دلائل کی بنیاد بنایا تھا جن میں سے پہلا خط نمبر ۲۰ مورخہ ۱۱؍مئی ۱۹۳۵ء (اقبالنامہ) (اگر لمعہ کے

بجلی کے علاج کے مشورے کو صحیح مان لیا جائے تو) علامہ اقبال کے دوسرے سفرِ بھوپال کے مشورے پر مبنی تھا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ عبدالقوی دسنوی صاحب نے لمعہ کے پہلے مشورے مکتوب نمبر ۱۶ مورخہ یکم دسمبر ۱۹۳۴ء (اقبال نامہ شیخ عطاءاللہ) کو یکسر نظر انداز کر کے گویا یہ قبول کر لیا تھا کہ لمعہ نے علامہ کو بھوپال میں بجلی کے علاج کا مشورہ دیا اور اگر یہ مان لیا گیا تو لامحالہ اُس خط کی صداقت بھی ثابت ہو گئی۔ دوسرے جس خط نمبر ۲۹ مورخہ ۳۱/ اگست ۱۹۳۷ء (اقبال نامہ) کا عبدالقوی دسنوی صاحب نے ردِ لمعہ کے لئے انتخاب کیا اُس کی صداقت مسلّم تھی۔ لہذا اب قارئین کرام ہی بتائیں کہ راقم جناب اکبر رحمانی صاحب کے حکم کی تعمیل میں ردِ لمعہ کے اپنے عمل میں عبدالقوی دسنوی صاحب کے ارشادات سے کیونکر اتفاق کر سکتا ہے اور اُن کو فوراً ہی مسترد کرنا کیا مجبوری نہیں تھی؟ "اقبال کے کرم فرما" کی کتابت مکمل ہو چکی تھی راقم کو صفحہ ۷۰ اور صفحہ ۹۸ کی چند سطور حذف کر کے عبدالقوی دسنوی صاحب کو جگہ دینا پڑی۔ صفحہ ۷۰ کے چھوٹے اور بڑے الفاظ کے سطور اس بات کی گواہ ہیں اور یہی اکبر رحمانی صاحب کے اس الزام کا جواب بھی ہے کہ راقم نے "ہماری زبان" میں عبدالقوی دسنوی صاحب کے مضمون کی اشاعت کے بعد انتہائی عجلت میں اپنی کتاب تحریر کی۔ قارئین کرام فیصلہ فرمائیں کہ دسنوی صاحب کے مضمون کی اشاعت ۸/ اپریل ۱۹۸۹ء اور کتاب کی اشاعت مئی ۱۹۸۹ء کے درمیانی کُل ستائیس دن کے قلیل وقفے (۵/ مئی کو کتاب تیار ہو چکی تھی) میں ایک ایسی کتاب جس میں ساٹھ سال پر محیط سینکڑوں دوریاں طے کی گئی ہوں کیا وجود میں آسکتی ہے؟

راقم کو نہایت افسوس ہے کہ بات جب اُس کی اپنی عزت پر آپڑی تو وہ اِن وضاحتوں پر مجبور ہوا۔ اس سے نہ تو کسی کی دلآزاری مقصود ہے نہ کسی پر سبقت لے جانے کی آرزو۔ حالانکہ سطورِ کتابِ مذکور سے وہ سب کچھ پہلے ہی سے ظاہر ہے جو سطورِ بالا میں کھل کر بیان کیا گیا۔ لیکن راقم کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ اس سے اُن کے موقف کو کیا تقویت مل سکتی ہے؟ وہ اس سے حفظِ باطل کے لئے کون سا نسخہ نچوڑ لیں گے؟ سچائی تو سچائی ہی رہتی ہے اُسے ماسٹر اختر، عبدالقوی دسنوی یا کوئی اور بدل نہیں سکتا۔

۵۔ اکبر رحمانی صاحب زیر بحث مضمون میں انتہائی خلاف قاعدہ جہاں اپنے ارشادات میں شعوری طور پر حوالوں کے استناد سے اس خوف سے محترز رہے کہ کہیں حوالوں کے سرے پکڑ کر قارئین اصل

سچائیوں کو نہ پالیں وہیں وہ اپنے حق میں غیر متعلق حوالوں کے بیجا استعمال سے بھی نہیں چوکے، اس کی اعلاترین مثال راقم کا ایک خط ہے جو اُن کے اچھے تحقیقی عمل پر اپنے ضمیر کی آواز پر لکھا گیا جس سے لمعہ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ موصوف نے اپنی تحقیق کی بیل ایک انتہائی نامعتبر و غیر مستند لمعہ کے تعلق سے اپنے ہی بیان کردہ ثبوت کے مونڈھے چڑھائی ہے جو آگے چل کر مختلف جرائد، رسائل، اخبارات و کُتب کے معتبر حوالوں سے غذا پا کر امربیل بن گئی ہے۔ یعنی یا لمعہ کی صداقت یا عدم صداقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ حقیقتاً یہ خط غازی رؤف پاشا کے سلسلے میں علامہ اقبال کی دہلی آمد کی صحیح تاریخ طے کرنے پر راقم کا پیغامِ مبارکباد تھا جس کا اُنہوں نے دروغ کی حد تک خلافِ تہذیب و ادب، بلا کسی احساسِ شرمندگی اور بلا کسی لحاظ دستور و روایات اس طرح استعمال کیا:۔

"خود ماسٹر اختر نے اس مضمون کی تعریف و توصیف کر کے لمعہ کو صدیق اور سچا ہونے کا اعتراف کیا ہے اور اُن کے فریبی ہونے کی نفی کی ہے"

اس ضمن میں تعریف کی بات یہ ہے کہ موصوف نے راقم کے خط کا پورا کا پورا متن بھی نقل فرمایا ہے جس میں لمعہ کی تعریف تو کیا اُس کا نام بھی نہیں ہے۔ جس میں موصوف کے مضمون کا عنوان "جامعہ ملّیہ اسلامیہ میں غازی رؤف پاشا کے خطبات" بھی درج ہے اور جس کی مدد سے قارئین وہیں کے وہیں ڈاکٹر جاوید اقبال کے خط سے نتیجہ باسانی اخذ کر سکتے ہیں کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ قارئین کرام اب یہ تو ہوئی پروفیسر اکبر رحمانی صاحب کے ایک بے سروپا الزام کی تردید کی بات لیکن اس سے بھی زیادہ اہم اور توجہ طلب وہ سوال ہے جو اُن کے اس عمل سے اُبھرا ہے کہ جب وہ ایک ایسے صاحبِ معاملہ کی تحریر کا جو اُن کی ہر جُنبشِ قلم پر گہری ناقدانہ نگاہ رکھتا ہے دِن کی بھری پُری روشنی میں اس حد تک غلط و نازیبا استعمال کر سکتے ہیں تو دوسروں کی تحریروں کا کیا حشر بناتے ہوں گے۔ لہذا قارئین کو اب یہ سمجھ لینے میں ذرا بھی دقت نہ ہوگی کہ راقم اُن کی پیش کردہ ہر دلیل کے پختہ ثبوت اور عکوس کی صداقت کی پیشگی تصدیق پر بضد کیوں ہے؟

۶۔ اکبر رحمانی صاحب نے زیر بحث مضمون کی آخری چند سطور میں اصل موضوع کو شجرِ ممنوعہ کی طرح اس طرح چھوا ہے کہ سند رہے اور وقتِ ضرورت کام آئے۔ "معارف" اپریل ۲۰۰۱ء میں راقم کے تمام سوالات کا جواب گویا یہی چند سطور ٹھہریں باقی سب تمہید ہی تمہید تھی۔ اس سلسلے میں عرض ہے

کہ اول تو راقم کو یقین نہیں کہ ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب اتنی اہم بات اس قدر سرسری اور غیر ذمے دارانہ کہہ سکتے ہیں اور بالفرض اگر انہوں نے ایسا کہا بھی ہے تو سراسر غلط، بلا تحقیق اور وقتی تاثرات پر مبنی ہے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے یہ اکبر رحمانی صاحب کی پیش کردہ دلیل یعنی یکم دسمبر ۱۹۳۴ء کے (صد فیصد جعلی) خط کی بنیاد پر ہی ارشاد فرمایا ہوگا کہ علامہ اقبال بجلی کے علاج کے لئے لمعہ کے مشورے پر بھوپال تشریف لے گئے تو پھر اس میں اکبر رحمانی صاحب کو درمیان میں لانے یا اس کا سہرا اُن کے سر باندھنے کا جواز ہی کہاں باقی رہا؟ جب جاوید اقبال صاحب کو بلا تحقیق ہی یہ فیصلہ کرنا تھا تو ''اقبالنامہ'' کا یہ محولہ خط ہی کیا کافی نہیں تھا جو پکار پکار کر گذشتہ ستاون سال سے کہہ رہا تھا کہ حضرت علامہ لمعہ کے مشورے پر بغرضِ علاج بھوپال تشریف لے گئے۔

راقم پہلے عرض کر چکا ہے کہ لمعہ نے اپنی شخصیت کے فروغ کی خاطر ایک خط کے مواد سے کئی کئی خطوط وضع کئے۔ شیخ عطاء اللہ صاحب مرتب ''اقبالنامہ'' نے اپنی نیک نیتی، سادگی اور ناتجربہ کاری کی بنا پر ہر ایک پر بھروسہ کیا۔ جس نے بھی جو کچھ جس شکل میں بھی بھیج دیا انہوں نے اسے من عن شاملِ کتاب کرلیا۔ چنانچہ زیادہ تر حضرات نے خطوط کے صرف متن ہی بھیجے۔ اُن کے اس غیر محتاط رویہ کی بنا پر مکاتیب اقبال میں سینکڑوں مسائل اُٹھ کھڑے ہوئے۔ لمعہ نے ۲۹ خطوط بھیجے جن میں سے صرف ایک اصل تھا جس کا عکس ''اقبالنامہ'' میں شامل ہے۔ لیکن لمعہ کی فریب کاریوں کے سبب یہ بھی مشکوک ہے کیونکہ اس میں مکتوب الیہ کا نام نہیں ہے۔ ان سب خطوط کے جائزے سے راقم اس نتیجے پر پہنچا کہ لمعہ کو علامہ اقبال نے جو خطوط تحریر فرمائے اُن کی تعداد زیادہ سے زیادہ چھ ہوسکتی ہے اور یہ بات راقم اپنی تحقیق کی بنا پر یقین سے کہہ سکتا ہے کہ علامہ نے لمعہ کو ایک خط بھوپال سے بھی تحریر فرمایا۔ جس کی مدد سے لمعہ نے تین خطوط گھڑے۔ خط نمبر ۱۶ مورخہ یکم دسمبر ۱۹۳۴ء، خط نمبر ۱۸ مورخہ ۲۰ر فروری ۱۹۳۵ء اور خط نمبر ۲۰ مورخہ ۱۱ر مئی ۱۹۳۵ء (''اقبالنامہ'' شیخ عطاء اللہ حصہ اول) یہ تینوں خطوط مکمل طور پر جعلی ثابت کئے جاچکے ہیں (ملاحظہ کیجئے اقبال کے کرم فرما) اصل خط انہی تینوں میں ضم ہو کر ضائع ہوگیا۔ ان خطوط کی تاریخیں بھی مقصد کو ملحوظ نظر رکھ کر رقم کی گئی ہیں۔ خط نمبر ۱۸ میں اُس وقت کی تاریخ درج ہے جب علامہ اقبال بھوپال تشریف فرما تھے اور اس خط کی ابتداء بھی اس جملے سے کی گئی ہے کہ ''یہ خط میں آپ کو بھوپال سے لکھ رہا ہوں''۔ خط نمبر ۱۶ یکم دسمبر ۱۹۳۴ء کا ہے جس میں علامہ اقبال نے

بھوپال بھی علاج کرانے کا لمعہ کا مشورہ قبول کیا ہے اور خط نمبر ۲۰ میں علامہ اقبال نے دوبارہ (دوسرا سفرِ بھوپال) علاج کرانے کا مشورہ قبول کیا ہے۔ یعنی مشورہ۔ شکریہ۔ اور پھر مشورہ۔ ان تینوں خطوط کی اصل عبارتوں کو اگر ملا کر پڑھا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ ایک ہی تحریر ہے جسے تین الگ الگ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک ایسی تحریر جو خواہ مخواہ محمدت و مدحت لمعہ سے لبریز ہے اور جو بہ اعتبارِ مزاج علامہ خود اپنی صداقت سے منکر ہے۔ پوری تحریر انتہائی پست معیارِ نگارش اور کم مایگی کی آئینہ دار ہے جس کا ایک جملہ بھی علامہ کے طریقے تحریرِ مکاتیب سے خفیف سی مطابقت نہیں رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی درجنوں ایسے دلائل و ثبوت ہیں جو ان خطوط کی صداقت کو یکسر مسترد کرتے ہیں (ملاحظہ کیجئے ''اقبال کے کرم فرما'')

اس کے علاوہ ایک نتیجہ رس منطق بھی سُن لیجئے جو ایک سوال ہے۔ جس کا جواب راقم اکبر رحمانی صاحب یا ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب سے نہیں چاہتا ہے بلکہ قارئین ''معارف'' سے چاہتا ہے۔ براہ کرم غور فرمائیں کہ علامہ اقبال کو بھوپال میں برقی علاج کا مشورہ دینے سے پہلے بائیس سال کی غیر پختہ عمر (پیدائش ۱۹۱۱ء) کے لحاظ سے اہلیتوں و لیاقتوں کے حامل بھوپال سے سینکڑوں میل دُور مہاراشٹر کی دور دراز کی دیہی بستی ٹونڈہ پور میں رہنے والے مسمّی لمعہ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ بھوپال میں یہ علاج دستیاب ہے جبکہ لمعہ کا بھوپال سے کوئی تعلق تو در کنار انہوں نے بھوپال کو کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا۔ نیز یہ کہ لمعہ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ علامہ اقبال کو کون سا مرض لاحق ہے جبکہ خود علامہ کو یہ علم نہیں تھا کہ وہ کس خطرناک مرض میں مبتلا ہیں اور آخر لمعہ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ علامہ کے مرض کا واحد علاج علاجِ برق ہے جبکہ لمعہ ڈاکٹر بھی نہیں تھے (''اقبال ریویو'' جنوری ۱۹۷۴ء) برخلاف اس کے اس علاج کا اہتمام کرنے والے، اُن کی میزبانی کے فرائض انجام دینے والے سر راس مسعود بھوپال میں وزیرِ تعلیم تھے، علامہ کے انتہائی قریبی دوست تھے، قدرداں تھے اور اُن تمام حالات سے بخوبی واقف تھے۔ مزید برآں معالجِ متعلق ڈاکٹر خان بہادر بھوپال میں اُن کے خاص مصاحبین میں سے تھے۔ علامہ کی علالت اور ضعف و نقاہت کے پیش نظر سفر کی تکالیف کے خیال سے علامہ کو مشورہ دینے سے پہلے کیا ڈاکٹر خان بہادر سے پیشگی مشورہ یا اُن سے یہ دریافت کرنا کہ بجلی کا علاج اُن کے لئے مفید رہے گا یا نہیں کیا ضروری نہیں تھا؟ اور اس فریضہ کو ساکنان ٹونڈہ پور اور شہر بھوپال میں سے کون زیادہ بہتری اور سہولت سے انجام

دے سکتا تھا؟ راقم کا قارئین کرام سے وہ سوال یہ ہے کہ اگر ایک ناخواندہ فرد کے سامنے بھی یہ حقائق رکھ کر اُس سے پوچھا جائے کہ علامہ اقبال کو بھوپال میں برقی علاج کے لئے کس نے مشورہ دیا ہوگا تو اُس کا کیا جواب ہوگا؟

۷۔ اکبر رحمانی صاحب نے ''اقبالنامہ'' شیخ عطاءاللہ میں لمعہ کے نام کے خطوط کے متن میں اضافوں کو بھی کتابت کی غلطی یا نقلِ متن کی غلطیوں کا نام دینے کی کوشش کی ہے جیسے ۳۱ راگست ۱۹۳۷ء کے خط نمبر ۲۹ میں فروغِ شخصیتِ خود کا یہ اضافہ:۔

''اور آپ سے ملاقات کی آرزو رکھتے نہیں۔''

یعنی علامہ اقبال حضرتِ لمعہ سے ملاقات کی آرزو رکھتے نہیں۔ اکبر رحمانی صاحب زیر بحث مضمون میں اس اضافی جملے کے تعلق سے فرماتے ہیں:۔

''ماسٹر اختر نے اس غلطی کو لمعہ کی فریب کاری و کارستانی کا نام دیا اور اندھیرے میں چلائے گئے اس تیر کے نشانے پر بیٹھ جانے کو اپنا کمال سمجھا۔ اگر اصل خط نہ ملتا تو کس کی مجال تھی کہ وہ اس غلطی کی نشاندہی کرتا''

قارئین ذرا لفظ غلطی پر غور فرمائیں کہ گویا آٹھ الفاظ کا یہ مکمل جملہ خود بخود وجود میں آگیا۔ بات پرانی ہونے کے سبب اکبر رحمانی صاحب بھول گئے کہ یہ راقم کی ہی مجال تھی کہ اُس نے محولہ خط کے منظرِ عام پر آنے سے تین سال قبل اس جملے کو خط کے متن سے الگ کر دیا تھا براہ کرم ایک بار اور ملاحظہ کیجئے ''اقبال کے کرم فرما'' صفحہ ۹۷۔۹۶

اب راقم کو قارئین کرام اور اقبالیات کے واردانِ نو کی دلچسپی اور معلومات کے لئے عرض کرنا ہے کہ راقم اس حد تک لمعہ مخالف نہیں کہ لمعہ کے علامہ اقبال سے سلسلۂ مراسلت کے پختہ ثبوتوں کے باوصف اقبالیات میں لمعہ کے وجود ہی سے انکار کر دے۔ ''اقبال کے کرم فرما'' کی اشاعت سے لے کر آج تک راقم کی یہی کوشش رہی ہے کہ لمعہ کا علامہ اقبال سے جس حد تک بھی حقیقی تعلق تھا اُس کی حدود کا تعین کر دیا جائے لیکن ۱۹۹۰ء میں اکبر رحمانی صاحب کے اس اعلان کے بعد کہ اُنہیں لمعہ کے نام سے علامہ کے بہت سے خطوط مل گئے ہیں یہ کام رُک گیا۔ لیکن اکبر رحمانی صاحب نے اُن خطوط کو منظرِ عام پر لانے کے بجائے ''اقبالنامہ'' کے بیشتر وضعی خطوط کی بنیاد پر اپنی تحقیق کی دس بارہ سال پُرانی مسمار شدہ عمارت کو پھر کھڑی کرنا شروع کر دیا۔ اُس پر اعتراض کرو تو جواب میں اعتراضات کو

پسِ پشت ڈال کر راقم کے تئیں اپنے قلم کے ہتک آمیز و غیر منصفانہ سلوک اور بے بنیاد الزامات و ہٹ دھرمی کو ہی ہر اعتراض کا جواب تصور کرتے ہیں۔ ''اقبال کے کرم فرما'' کی اشاعت سے پہلے علامہ اقبال سے لمعہ کے گہرے تعلق کی کئی محیر القول کہانیاں اپنی قوتِ تخلیق سے عام کر چکے ہیں۔ وہ اس معنیٰ میں کہ یہ کہانیاں لمعہ نے اُنہیں لکھ کر نہیں دی تھیں۔ سنائی تھیں۔ رحمانی صاحب نے ان کہانیوں کو اپنے دستِ مبارک سے رقم فرمایا اور ہٹ دھرمی کی انتہا یہ ہے کہ یہی دستِ مبارک ان کہانیوں کی صداقت کی دلیل بھی ہے اور ثبوت بھی۔ پھر برسوں کی خاموشی کے بعد متنازعہ خطوط کی صداقت ثابت کرنے سے پہلے انہی خطوط کی بنیاد پر اب عازمِ نشاتِ دوئم ہیں جیسا کہ اُن کی ''معارف'' میں اعلان شدہ کتاب کے عنوان ''مکاتیب اقبال کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ'' سے ظاہر ہے۔ مقصد یہ ہے کہ برقی علاج کے مشورے جیسے غلط دعوے قبول کر لئے جائیں تو مکتوبِ متعلق کی صداقت خود بخود ثابت ہو جائیگی اور ظاہر ہے کہ خطوط میں لمعہ کی بہتری و برتری کے ادب، فلسفہ، معاشیات، سیاست، معاشرت، ذاتی قابلیت و لیاقت اور بلند بالا شخصیات سے قربت و ذہنی ارتباط کے تعلق سے سینکڑوں نقرئی نقوش پہلے ہی ثبت ہیں۔ غور طلب ہے کہ پروفیسر اکبر رحمانی صاحب نے ایک انتہائی آسان مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اتنا تضیع الوقت اتنا طویل اور اتنا ٹیڑھا راستہ کیوں اختیار کیا۔ کیوں؟ یہ بیان بازیاں، یہ دعوے و جواب دعوے اور یہ تسلیاں کیوں؟ کیا اس کا یہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا کہ لمعہ کی فریب کاریوں کے الزام کو مسترد کرنے کے لئے کوئی ایسا کاغذی ثبوت موجود نہیں ہے جسے دوسرے چھو سکیں، دیکھ سکیں اور اس کی جانچ پرکھ کر سکیں؟ اور اگر ہیں تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ یہ معاملہ برسوں میں نہیں، مہینوں میں نہیں، ہفتوں میں نہیں، دنوں میں نہیں، گھنٹوں میں نہیں منٹوں میں سلجھ سکتا ہے۔ اُن بے داغ ثبوتوں کو جو حضرتِ لمعہ کی کارگذاریوں سے بچ گئے ہوں پیش کر دیجئے اور سرخرو ہو جائیے۔

معارف: دونوں حضرات سے اس سلسلے کو بند کرنے کی درخواست ہے، اس کی ابتدا اکبر رحمانی صاحب نے کی تھی، اس لئے ماسٹر اختر صاحب کے جواب پر یہ سلسلہ معارف میں ختم کیا جاتا ہے۔

ادبیات

غزل

از جناب وارث ریاضی صاحب ★

یہ کس مقام تحیر پہ آگیا اے دوست
کہ میں بیگانۂ دنیا و دیں ہوا اے دوست

غم زمانہ، غم زندگی، غم جاناں
کبھی ٹوٹا ہی نہیں غم کا سلسلہ اے دوست

کہاں جاؤں؟ پکاروں کسے؟ کہ دنیا میں
ترے سوا نہیں کوئی بھی آشنا اے دوست

زمیں پہ ڈھونڈ لیا، آسماں سے ہو آئے
نہیں ملا ترے کوچے کا راستہ اے دوست

بنایا اور بنا کے اسے بگاڑ دیا
عجیب ہے تری مخلوق کی سزا اے دوست

وہی گناہ کیے ہیں جو لکھ دیے تو نے
تو اس میں کون سی میری ہوئی خطا اے دوست

وفا پہ حسرت لطف و کرم معاذاللہ
زہے خلوص کے بدلے تری جفا اے دوست

ملا ہوں جب بھی کسی سے خلوصِ دل سے ملا
کہ میرے دین میں نفرت نہیں روا اے دوست

ترے مریضِ محبت کا ہے خدا حافظ
کہ دردِ دل نہیں منت کشِ دوا اے دوست

یہی تو رنج ہے ساحل پہ آکے ڈوب گئی
خدا رسیدہ تھا، کشتی کا ناخدا اے دوست

سبھی عزیز و اقارب نے پھیر لیں آنکھیں
خلوص کا یہ زمانہ نہیں رہا اے دوست

عزیز کیوں نہ ہو وارث کو ساری دنیا سے
کہ زندگی کا ہے حاصل تری رضا اے دوست

کلیات شبلی (اردو)

یہ علامہ شبلی کی تمام اردو نظموں کا مجموعہ ہے جس میں مثنوی صبح امید، قصائد جو مختلف مجلسوں میں پڑھے گئے اور وہ تمام اخلاقی، سیاسی، مذہبی اور تاریخی نظمیں جو کانپور، ترکی، طرابلس، بلقان، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی وغیرہ کے متعلق لکھی گئی تھیں اور مختلف اخباروں اور رسالوں میں شایع ہوئی تھیں، مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کو بڑی محنت سے اس مجموعہ میں یک جا کر دیا ہے، اس کے شروع میں ان کے قلم سے علامہ کی شاعری پر ایک مبسوط مقالہ بھی ہے۔ یہ نظمیں مولانا شبلی کے شاعرانہ کمالات کا ثبوت اور مسلمانوں کے چہل سالہ جدوجہد کی ایک مکمل تاریخ ہے۔ ضخامت ۱۳۰ رصفحے اور قیمت ۲۵ روپے

★ کاشانۂ ادب سکلا دیوراج، پوسٹ بسوریا وایا لوریا مغربی چمپارن، بہار

مطبوعات جدیدہ

تفسیر نظام القرآن وتاویل الفرقان بالقرآن سورۃ البقرہ
تالیف الامام عبدالحمید الفراہی، کاغذ عمدہ، کتابت کمپیوٹر، طباعت آفسیٹ، صفحات ۲۹۶، خوبصورت جلد، قیمت تحریر نہیں، پتہ: دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گرہ (الہند)

قرآن مجید ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے غور وفکر کا خاص محور رہا ہے، اپنے تمام علائق و مشاغل اور دلچسپیوں سے دست بردار ہوکر عمر بھر وہ اسی بحرِ ناپیدا کنار کی شناوری کرتے رہے، اس کے نتیجہ میں اللہ نے انہیں اپنے کلام کی تفسیر وتاویل کا خاص ملکۂ راسخہ اور حقائق و معارفِ قرآنی کے فہم وتدبر میں شرحِ صدر عطا فرمایا تھا، مولانا نے قرآنی علوم ومعارف میں جو تصانیف یادگار چھوڑی ہیں ان میں کئی نامکمل اور غیر مرتب ہیں، نظام القرآن کے نام سے جو مہتم بالشان تفسیر لکھنا چاہتے تھے اس کے بھی صرف آخرِ قرآن کی چند متفرق سورتوں ہی کی تفسیریں مولانا کے قدر دانوں اور علومِ قرآن کے شیدائیوں کے ہاتھ لگی، ان کی تصنیفی زبان عربی تھی، ان کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحی نے اردو والوں کے لئے بھی اس قیمتی خزانہ اور مولانا فراہیؒ کے تدبر فی القرآن کے نتائج کو عام کردیا۔

مولانا کے مسودات میں سورۂ بقرہ کی یہ نامکمل عربی تفسیر بھی تھی جو غالباً آخرِ عمر میں لکھنی شروع کی تھی جب علالت اور مرض کی شدت نے ان کو لکھنے پڑھنے سے معذور کر دیا تھا اس لئے

یہ ابتداء سے باسٹھ آیات تک کی ہی تفسیر پر مشتمل ہے اور اس پر نظر ثانی اور اضافہ کا موقع نہیں مل سکا تاہم اس نامکمل تفسیر کا جس قدر حصہ بھی موجود ہے وہ اہم اور مولانا کے فکرِ سلیم اور وہبی ملکۂ تفسیر کا نمونہ اور ان تمام معارف وحقائق اور نوادر ونکات پر مشتمل ہے جو ان کے عام رسائلِ تفسیر کی امتیازی خصوصیت ہے۔

مولانا کے نزدیک قرآن مجید کی سورتیں کئی اجزا پر مشتمل ہوتی ہیں، یہ سورہ بھی کئی اجزا پر مشتمل ہے اس کا پہلا جز ابتدائی پانچ آیتوں کا مجموعہ ہے، مولانا کے طریقۂ تفسیر کو واضح کرنے کے لئے یہاں اسی جز کے انتخاب پر اکتفا کیا جائے گا، اس میں پہلے اس جز کے حسب ذیل الفاظ کی تشریح کی گئی ہے۔ الٓمٓ. ذٰلِکَ. اَلْکِتَابُ. لَارَیْبَ فِیْہِ. ھُدًی. لِلْمُتَّقِیْنَ. یُؤْمِنُوْنَ. بِالْغَیْبِ. یُقِیْمُوْنَ. اَلصَّلٰوۃَ. رَزَقْنٰھُمْ. یُنْفِقُوْنَ. اَلْاٰخِرَۃِ. یُوْقِنُوْنَ. عَلٰی ھُدًی. مُفْلِحُوْنَ، ان کی تشریح میں قرآن کے نظائر اور کلامِ عرب کے شواہد بکثرت پیش کئے گئے ہیں مگر طوالت کے خوف سے مثالیں قلم انداز کی جاتی ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے الفاظ اور جملوں کی ترکیبِ نحوی بیان کی ہے مثلاً اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ میں اَلَّذِیْنَ کو مجرور بتایا ہے اس لئے کہ اس کا ھُدًی لِلْمُتَّقِیْنَ میں متقین کی صفت ہونا بالکل واضح ہے اور اس کے شواہد بھی پیش کئے ہیں اور اعراب کی بعض اور صورتیں بھی زیرِ بحث آئی ہیں۔

اس کے بعد کلام کی بلاغت اور اسلوبِ بیان کی بعض خوبیاں دکھائی ہیں، پھر اس مجموعۂ آیات کے جو مقامات خاص طور پر فکر وتدبر کے لائق ہیں ان میں سے دس کو منتخب کر کے ان پر بڑی غائرانہ نگاہ ڈالی ہے، اس میں الٓمٓ اور اس کے ضمن میں حروف مقطعات کی بحث خاص طور پر لائق توجہ ہے، پانچویں بحث میں اس مجموعۂ آیات کے ربط ونظم اور مناسبت وتعلق پر تین پہلوؤں سے گفتگو کی ہے، آخری پہلو میں اس مجموعۂ آیات سے اس کے بعد آنے والی دوسرے جز کی آیتوں کا ربط وتعلق بتایا ہے۔

اس سورہ کے جن اجزا کی آگے تفسیر کی گئی ہے ان میں بھی پہلے ہی جز جیسا انداز اختیار

کیا گیا ہے لیکن کہیں کہیں موقع ومقام کی نوعیت سے بعض اور مباحث بھی آگئے ہیں مثلاً صفحہ ۱۳۸ تا ۱۴۱ پر ختم وغشاوہ کی اور صفحہ ۱۷۴ تا ۱۸۸ پر جنت کی حقیقت کی بحث۔ یا کہیں خطاب کی تعیین ضروری ہوئی تو اس کی وضاحت کی ہے جیسے سترہ تا بیس آیات کے مجموعہ کے بعد اکیسویں آیت سے خطاب کی نوعیت بدل گئی اس لئے سترہ تا بیس آیات کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں کہ ”ابتداء سے یہاں تک بیس آیتیں ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ ﷺ سے خطاب کر کے کہا ہے کہ وہ لوگوں کو آگاہ فرمادیں کہ اشخاص کی تین قسمیں ہوتی ہیں، ۱۔ متقین: جو قرآن سے ہدایت حاصل کرنا چاہتے ہیں آپ کی توجہ کا مرکز یہی لوگ ہونے چاہئیں، ۲۔ کھلم کھلا انکار کرنے والے اور اپنے کفر پر اصرار کرنے والے، ۳۔ مفسد منافقین: ان کے رویہ پر آپ کو حزن وملال نہیں کرنا چاہئے اور نہ ان کے پیچھے اپنا وقت برباد کرنا چاہئے“ اسی طرح مجموعۂ آیات (۲۸ و ۲۹) کی تفسیر کرتے ہوئے ان کے طریقِ استدلال کی یہ بحث کہ ”ان میں کئی دلائل جمع ہو گئے ہیں، ۱۔ خالق کا اثبات، ۲۔ معاد کا اثبات، ۳۔ شرک کا ابطال، ۴۔ اللہ کی اطاعت کا لزوم“ پھر ان دلائل کی وضاحت جس کو قلم انداز کیا جاتا ہے، تفسیر کے آخر میں عہدِ الٰہی کے بیان میں ایک مقدمہ ہے اس کو قلم بند کرنے اور عہد ومیثاق کی وضاحت کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اس سورہ میں میثاق اور عہد شکنوں کا اکثر ذکر آیا ہے، اس کے بعد ایک باب آتا ہے جس میں شروع سے ۱۵۲ تک کی آیات پر ایک اجمالی نظر ڈال کر نبوت کا عموماً اور بعثتِ نبوی کا خصوصاً اثبات کیا گیا ہے اور دلائل پر متعدد حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے اور آخر میں سورہ کے نظام کے عنوان سے آیات ۱ تا ۱۵۲ کا تجزیہ کر کے بتایا ہے کہ ان میں کیا مضامین بیان ہوئے ہیں اور یہ کن لوگوں کے متعلق ہیں، مخاطب کون ہیں، دوسرے باب میں ۱۵۳ سے ۱۷۷ تک کی آیات کا تجزیہ کر کے تزکیہ کی اصل ذکر، شکر اور تقویٰ پر بحث ہے، تیسرے باب میں آیات ۱۷۸ تا ۲۴۲ کا تجزیہ کر کے شرائع مطہرہ اور قوانین پر بحث ہے، چوتھے باب میں آیات ۲۴۳ تا ۲۸۳ کے حوالے سے ایک امت کے برپا ہونے اور اس کے بقا وارتقا کے اسباب کا ذکر ہے، سب سے آخر میں سورہ کی آخری تینوں

آیتوں کی وضاحت ہے۔

تفسیر کے مندرجات کا یہ اجمالی جائزہ ہے، مولانا نے اس میں جو عالمانہ اور دقیق مباحث چھیڑے ہیں ان کو پڑھ کر طبیعت بے اختیار وجد کرنے لگتی ہے، جن مقامات سے مفسرین سرسری گذر جاتے ہیں مولانا کا ذہن رسا اور فکرِ سلیم وہاں نکتہ آفرینیوں اور دقیقہ سنجیوں کے باغ لگادیتی ہے، اس کتاب کا مقدمہ بھی نہایت اہم ہے جو دس فصلوں پر مشتمل ہے، پہلی فصل میں سورہ کی حقیقت و نوعیت، اپنے سے مقدم سورہ فاتحہ اور مؤخر سورۂ آلِ عمران سے اس کا ربط و تعلق دکھایا گیا ہے، دوسری فصل میں سورہ بقرہ کے موضوع و مقصد کا ذکر ہے، تیسری فصل میں اس کی غایت و مقصد سے اس میں بیان کئے گئے واقعات کی مطابقت دکھائی گئی ہے، چوتھی فصل میں اس کا ذکر ہے کہ سورہ کے مقصد کا لب لباب استخلاص کعبہ ہے، پانچویں فصل میں بنی اسرائیل کے واقعہ سے سورہ کی مطابقت دکھائی ہے، اسی طرح نبی اکرم ﷺ کے حالات، زمانۂ نزول اور مخاطبین کے حالات سے بھی سورہ کی مطابقت بیان کی گئی ہے اور دسویں فصل میں سورہ کے اجزا اور ان کے نظام پر اجمالی نظر ڈالی گئی ہے، ان فصلوں میں جو حقائق و نکات بیان کئے گئے ہیں ان کی قدر و قیمت کا اندازہ مطالعہ ہی سے ہوسکتا ہے۔

شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے تحریر کردہ مصنف کے حالات درج ہیں، مصنف کے پوتے پروفیسر عبیداللہ فراہی اہلِ علم کے شکریے کے مستحق ہیں کہ علم و حکمت سے معمور اس خزانہ کو انہوں نے تحقیق و تحشیہ کے لوازم کے ساتھ شائع کیا ہے، ان کے دیباچہ میں کتاب کی نوعیت و کیفیت، مولانا کے تفسیری نہج اور اس کے اصلی و بنیادی محور نظام القرآن اور تاویل الفرقان بالقرآن پر مفید اور اچھی بحث کی ہے، اس میں نظام اور مناسبت کا فرق بھی واضح کیا ہے اور احادیث، لغت اور اسرائیلیات کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر بھی بتایا ہے۔

اس کتاب پر مزید تفصیل سے معارف کے باب التقریظ و الانتقاد میں لکھا جاتا تو تبصرہ و تعارف کا کچھ حق ادا ہوتا مگر سردست اسی پر اکتفا کرنا پڑا۔ ”ض“

تصانیف سید صباح الدین عبدالرحمٰن

☆ **بزم تیموریہ**: اس میں ہندوستان کے تیموری سلاطین کی علم دوستی و علم پروری کی تفصیل عہد بہ عہد ذکر کی گئی ہے۔ قیمت جلد اول: ۱۵۰ روپے جلد دوم ۵۰ روپے سوم ۵۶ روپے

☆ **بزم صوفیہ**: مشائخ صوفیہ کا تذکرہ اور ان کی مستند سوانح عمری۔ قیمت: ۱۱۵ روپے

☆ **اسلام میں مذہبی رواداری**: قیمت: ۶۵ روپے

☆ **ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری**: حصہ اول: ۳۰ روپے دوم: ۳۸ روپے۔ سوم: ۵۶ روپے

☆ **ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے**: سلاطین ہند کی معاشرتی و تہذیبی زندگی کی مرقع آرائی کی گئی ہے۔ قیمت: ۸۰ روپے

☆ **ہندوستان کے سلاطین علماء و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر**: قیمت ۷۵ روپے

☆ **عہد مغلیہ میں ہندوستان سے محبت و شیفتگی کے جذبات**: قیمت ۴۰ روپے

☆ **ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں**: قیمت: ۲۵ روپے

☆ **حضرت خواجہ معین الدین چشتی**: قیمت: ۱۰ روپے

☆ **حضرت ابوالحسن ہجویری**: قیمت: ۵ روپے

☆ **مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر**: قیمت: ۲۵ روپے

☆ **محمد علی کی یاد میں**: قیمت: ۳۵ روپے

☆ **بزم رفتگاں**: جلد اول: زیر طبع، جلد دوم: ۳۵ روپے

☆ **غالب مدح و قدح کی روشنی میں**: جلد اول: زیر طبع جلد دوم: ۵۰ روپے

☆ **مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف کا مطالعہ**: قیمت: ۷۰ روپے

☆ **مولانا سید سلیمان ندوی کی دینی و علمی خدمات**: قیمت: ۱۵ روپے

☆ **ہندوستان کے عہد وسطی کی ایک جھلک**: قیمت: ۸۰ روپے

☆ **صوفی امیر خسرو**: قیمت: ۳۰ روپے